दिनांक : 14.05.2017
स्थान : 5 कालीदास मार्ग, लख

मुख्य अतिथि

جلد : ۷۲ شمارہ : ۳

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جون ۲۰۱۷ء

پبلشر: انج کمار جھا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈوائزر
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

ایڈیٹر
سہیل وحید

فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 115
Email:
nayadaurmonthly@gmail.com

تزئین کار : وقار حسین

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِسالانہ : ایک سو دس روپے
فی شمارہ : دس روپے

ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001
Please send M.O./Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ رجسٹری:
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

عنوانات

اداریہ

اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

مضامین

راجندر سنگھ بیدی اور فلم انڈسٹری ..... محمد عالم ۵
کرشن چندر؛ افسانہ نگاری سے فلم نویسی تک ..... شفیق احمد ۹

افسانے

آخری فریم ..... مشرف عالم ذوقی ۱۳
نسخہ ..... ڈاکٹر مسرور صغریٰ ۱۹
ایک بے عنوان افسانہ ..... ہلال نقوی ۲۳
تشنہ لبی ..... راجیو پرکاش ساحر ۲۵

گزشتہ لکھنؤ

اودھ پنچ اور دیگر جرائد ..... مرزا جعفر حسین ۳۱

ہندی کہانی

دعوت عداوت ..... س.ر. یاتری ۳۷

ہندوستانی زبانیں

ایندھن (دوسری قسط) ..... حمید دلوائی ۴۱

غیر ملکی ادب

محبت کا قتیل ..... محمد عبدالحلیم عبداللہ ۵۱

غزلیں و نظمیں

غزلیں ..... نواز دیوبندی ۳
غزلیں ..... عالم خورشید، اشہر ہاشمی ۴
غزلیں ..... تارا اقبال، سلیم اختر ۱۲۲
غزلیں ..... امیر امام، ظفر نقی ۱۸
غزلیں ..... فوزیہ رباب، قمر عباس قمر ۲۲
نظم وغزل ..... سیاسچدیو ۲۷
نظمیں ..... فوزیہ فاروقی ۲۸
نظمیں ..... سراج اجملی ۲۹
غزلیں ..... ڈاکٹر امتیاز ندیم، ساون شکلا ۳۰
غزلیں ..... وجئے تیواری وجئے، اظہر سلیم ۴۰

نقد و تبصرے

ادبیات وشخصیات ..... شاہ نواز قریشی ..... منظور احمد صدیقی ۵۵
بچوں کے ربندر ناتھ ..... شبیر احمد ..... شاہد کمال ۵۶

نیا دور میں شائع ہونے والی تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

'نیادور' کا نیا رنگ و آہنگ لوگوں کو اس قدر بھا جائے گا، اسکی امید تو تھی لیکن ایک خائفہ سا بھی تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم نے اپنی روایات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن جدید دور کے تقاضوں پر کھرا نہ اترا جائے، یہ بھی ہمیں منظور

> نیادور کا عام شمارہ (مئی 2017) خاصی مدت کے بعد منظر عام پر آیا تو ہم نے سکون کی سانس لی۔ کیونکہ جس طرح ڈاکٹر صادق کے لفظوں میں ''سڑکوں کی بھیڑ فرد کی پہچان کھا گئی'' اسی طرح خصوصی شماروں کی بھیڑ میں عام شماروں کی پہچان گم بلکہ معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ سہیل وحید کی ادارت میں نیادور کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ اس کے صفحات پر سہیل وحید کی ادارت جلوے بکھیر رہی ہے۔ موجودہ عہد کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا عہد ہے۔ اس میں جدید ٹیکنالوجی نے اخبارات اور رسائل و جرائد کو زیادہ پرکشش بنانے کے بڑے مواقع فراہم کر دیئے ہیں۔ نیادور کو بھی اس ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ سہیل وحید نے نیادور کو مواد کی پیشکش، آرائش اور ڈیزائن کی نئی سہولتوں سے پرکشش بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ لیکن انہیں یہ خیال رکھنا ہوگا کہ نیادور ایک سنجیدہ اور پروقار ادبی رسالہ ہے۔ چنانچہ یہ ڈائجسٹ نہ بننے پائے۔ سہیل وحید نے اداریہ میں جو وعدے بلکہ دعوے کئے ہیں امید ہے وہ پورے ہوں گے۔ وہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال کے ماہر ہیں۔ رہے ہم جیسے افراد تو اس اعتبار سے اگلے وقتوں کے لوگ ہو چکے ہیں۔ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ وہ کسی اعتبار سے غالبؔ کے طرفدار نہیں بنیں گے بلکہ سخن فہم ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہیں گے۔ ایک دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ فی الحال عام شماروں پر ہی توجہ مرکوز رکھیں اور ہر شمارے کو یادگار بنانے کی کوشش کریں۔ کیونکہ انہوں نے بھی اگر خاص نمبر نکالنے پر زیادہ توجہ دی تو وہ بھی بالآخر خود ''نمبری'' ہو جائیں گے۔
>
> **شاہنواز قریشی**
> سابق ایڈیٹر نیادور

نہیں۔ ہم تکنیک کے اس دور کے پروردہ ہیں جہاں تخلیق کو کمتر درجہ کی چیز سمجھنے کا چلن عام ہے۔ لیکن حقیقت اس کے اک دم برعکس ہے۔ عالمی سطح پر محاسبہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ گارسیا گیبرئیل مارخیز جیسا لافانی تخلیق کار جدید دور کی ہی دین ہے۔ واپس ہندوستان آئیں تو وکرم سیٹھ اور اروندھتی رائے بھی جدید دور ہی کی پروردہ ہیں۔ ہندی کے مشہور و معروف ناول نگار اُدئے پرکاش بھی اسی دور میں جادو بکھیر رہے ہیں۔ اپنے یہاں گلزار اور مشتاق احمد یوسفی ہیں۔

ہمیں زیادہ سے زیادہ تکنیکی فوائد حاصل کرنے

> ''نیادور'' مئی ۲۰۱۷ کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو اپنی رائے پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اداریئے سے 'نقد و تبصرے' کے حصے تک بے اختیار مدیر کے حسن انتخاب کی داد دینے کو جی چاہا۔ خاص طور پر اداریئے میں جس طور رسالے کے نقوش متعین کرنے کی بات کی گئی، اس نے ایک بات تو واضح کر دی کہ برخلاف عام رسائل کے ''نیادور'' کے مشمولات اردو کے ساتھ علاقائی اور عالمی ادب کا احاطہ کریں گے جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ایک دور تھا جب اردو کا ادبی سرمایہ عالمی اور علاقائی ادب کے تراجم سے مالا مال تھا مگر گذشتہ تیس برسوں میں بہ وجوہ ادبی تراجم کی جانب بہت کم توجہ کی گئی جس کی وجہ سے اردو کے ادیب اور شاعر دوسری زبانوں کے ہم عصر سے اجنبی ہوتے چلے گئے نتیجہ یہ نکلا کہ خود اردو تخلیقات محدود مطالعے کے باعث رازگی سے محروم ہونے لگی ہیں۔ ''نیادور'' کی یہ کاوش نہ صرف نئے تخلیق کاروں کی تحریروں کو نیا رنگ دے گی بلکہ قاری کے مطالعے کی حدود بھی وسیع کرے گی۔
>
> دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ شمارہ تنقید، افسانوی ادب اور شاعری کے ساتھ ''گذشتہ لکھنؤ'' سے متعلق گوشے پر مشتمل ہے۔ لکھنؤ کی تہذیبی وراثت کے مٹتے ہوئے نقوش کو دوبارہ اجاگر کرنے کا حق ''نیادور'' کو ہی پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر مظہر احمد اور ارشاد نیازی کے مضامین خوب ہیں اور ڈگر سے ہٹ کر ہیں۔ شموئل احمد افسانے کا ایک معتبر نام ہے ''عدم گناہ'' کا موضوع منفرد ہے۔ اسرار گاندھی کے افسانوں کے موضوعات اردگرد کی چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ سماجی عدم مساوات جو معاشرے کی جڑوں میں گہرائی تک پیوست ہے، ''غبار'' اس کا خوبصورت اظہار ہے۔ شمارہ دیدہ زیب ہے۔
>
> **ڈاکٹر نجمہ رحمانی**
> شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

چاہئے اور تخلیق کے نئے سوتوں پر نگاہ رکھنی بھی ضروری ہے۔ ہمیں بیحد خوشی ہے کہ 'نیادور' کے سابق مدیر شاہنواز قریشی نے اس سمت ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔

اردو کے لئے جدید تکنیک کا کثرت سے استعمال ہی اس کے فروغ کی ضمانت بنے گی۔ ہمیں اردو کے لئے بطور خاص نئی تکنیک کے موجد بھی پیدا کرنے ہوں گے۔ افسوس ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان اردو کو تکنیکی پیراہن عطا کرنے میں جنوبی ہندوستان سے کافی پسماندہ ہے۔ کوئی بھی زبان صرف اپنے ادب اور اپنی تہذیب کے سہارے بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ حالانکہ زبانیں ایک فطری عمل کے تحت جنم لیتی رہتی ہیں اور فوت ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان تو ہر پانچ کوس پر بدل جانے والی بولیوں اور ۴۵۴/ زبانوں والا ملک ہے۔ اس کثیر الجہتی میں اردو اپنی شناخت قائم کئے ہوئے ہے تو اسے لائق تحسین تصور کیا جانا ضروری ہے۔

> ماہ مئی کا شمارہ اپنے نئے رنگ، آب و تاب اور تازگی کے ساتھ کئی معنوں میں اپنی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔
>
> اداریہ میں بڑی بے باکی سے لائحہ عمل کا ذکر کیا گیا ہے جو یقیناً ایک خوشگوار قدم ثابت ہوگا۔ اردو قارئین کو غیر ملکی ادب اور ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں کے ادب سے روشناس کرانا یقیناً ''نیادور'' کے لئے ایک بہت ہی کامیاب تجربہ ہوگا۔ شموئل احمد، اسرار گاندھی اور عادل فراز کے افسانے موضوعاتی لحاظ سے کامیاب افسانے ہیں۔ یہ تینوں افسانے اپنے اپنے انداز میں زندگی کا مختلف زاویہ سے احاطہ کر کے منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ تمام غزلیں بھی خوبصورت ہیں۔
>
> ایک بار پھر سے ایک ایسے شخص کو 'نیادور' کی ادارت کی ذمہ داری دی گئی ہے جو بذاتِ خود ایک تخلیق کار ہے اور ادب کیلئے ایک نیا وژن رکھتا ہے لہٰذا 'نیادور' ایک بار پھر نئی بلندی کے ساتھ اپنی ایک الگ شناخت قائم کرے گا۔
>
> **ڈاکٹر احتشام خان**
> مسکان اپارٹمنٹ، وزیر حسن روڈ، لکھنؤ

ہمیں بیحد خوشی ہے کہ مئی کے شمارے کو اس قدر پسند کیا گیا۔ ہم کوشش کریں گے کہ 'نیادور' کا ہر شمارہ بہتر سے بہتر ہو۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے افراد تک اس کی رسائی ہو۔

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر نجمہ رحمانی اور امریکن انسٹیٹیوٹ آف لینگویج کے ڈاکٹر احتشام کے خطوط سے بڑی تشفی پہنچی ہے۔ 'نیادور' کے آئندہ شماروں میں نئے تخلیق کاروں کو زیادہ سے زیادہ فراہم کیا جائے گا۔

سہیل وحید

غزلیں

ڈاکٹر نواز دیوبندی
محلہ قلعہ، دیوبند، سہارنپور
موبائل: 9319155237

یہ حادثہ بھی ہوا ہے تجھے بھلاتے ہوئے
میں رو پڑا ہوں کئی بار مسکراتے ہوئے

ہمارے ہاتھ جلے ہیں دیا جلانے میں
تمہارے ہاتھ جلے ہیں دیا بجھاتے ہوئے

وہ رو رہا تھا مری داستان سنتے ہوئے
میں ہنس رہا تھا اسے داستاں سناتے ہوئے

میں مان جانے کو تیار ہو گیا لیکن
وہ اپنے آپ سے روٹھا مجھے مناتے ہوئے

میں چاہتا تھا کہ میں خود ہی زیر ہو جاؤں
وہ خود ہی گر گیا لیکن مجھے گراتے ہوئے

تعلقات ملاقات پر نہیں موقوف
دعا، سلام تو ہو جائے آتے جاتے ہوئے

خدا، یہ ماجرہ کیا ہے کہ گھر نہیں بنتا
میں بوڑھا ہو گیا، دیوار و در بناتے ہوئے

زمین ایسے ہی سجدے پہ ناز کرتی ہے
جب ایک سجدہ کیا جائے سر کٹاتے ہوئے

اک ہاتھ تختی بنانے میں کٹ گیا تھا مرا
اک انگلی کٹ گئی میری قلم بناتے ہوئے

رلایا اس نے یہ غم ہے مگر خوشی بھی ہے
وہ خود بھی رویا تھا ظالم مجھے رلاتے ہوئے

غریب لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں
محل کے خواب تھے مٹی کے گھر بناتے ہوئے

کس احتیاط سے میں نے بنایا آئینہ
میں خود ہی ٹوٹ گیا آئینہ بناتے ہوئے

میں عکس ہوں اس عکس کا کردار تو تم ہو
سایہ تو میں ہوں پر مری دیوار تو تم ہو

دنیا کو سناؤں کہ میں دنیا سے چھپاؤں
تم نظم ہو میری، مرے اشعار تو تم ہو

ہم ہی تو مناتے ہیں ہمیں کہتے ہو بیزار
منھ پھیرے ہوئے بیٹھے ہو بیزار تو تم ہو

ہر بات کو کہتے ہو کہ ممکن ہی نہیں ہے
لگتا ہے مرے رستے کی دیوار تو تم ہو

بیمار سمجھ کر مجھے ہنستے ہو بہت تم
محسوس یہ ہوتا ہے کہ بیمار تو تم ہو

بے مول ہی بک جائیں گے ہو جائیں گے انمول
سنتے ہیں کہ اس بار خریدار تو تم ہو

مانا کہ گنہگار محبت ہوں میں لیکن
تم غور کرو اصلی گنہگار تو تم ہو

لوگوں سے چھپاؤں بھی تو کس طرح چھپاؤں
میں ایک خبر ہوں مگر اخبار تو تم ہو

غزل

خشک ہوتے ہوئے زخموں کو ہرا ہونا تھا
اور تجدید ملاقات سے کیا ہونا تھا

رات ٹھہرا تھا کوئی خواب مری آنکھوں میں
صبح ہوتے ہی مسافر کو جدا ہونا تھا

ہم نے اس بار بھی کردار مثالی رکھے
اس کہانی کا بھی انجام سوا ہونا تھا

وقت کے ہاتھ نے کچھ اور ہی لکھا اس پر
جس ستارے پہ مرا نام لکھا ہونا تھا

ہم نے دنیا کو بدلنے کی جسارت کی تھی
اہلِ دنیا کو بہ ہر حال خفا ہونا تھا

اور کب تک انہیں اشجار سنبھالے رکھتے
پک گئے تھے جو ثمر ان کو جدا ہونا تھا

بے سبب راہ میں بھٹکو گے کہاں تک عالم!
گھر سے نکلے تھے تو منزل کا پتہ ہونا تھا

عالم خورشید
304، گلشن وہار، عالم گنج، پٹنہ (بہار)
موبائل: 9835871919

غزل

وحشت کے ہر اک منظر سفاک میں تم ہو
یا مرے گریبان کے ہر چاک میں تم ہو

تم میری ہر اک چیخ میں، ہذیان میں شامل
خاموشی میں تم، جذبۂ بے باک میں تم ہو

پیشانی کی سلوٹ ہو کہ ہونٹوں کا تشنج
یا آنکھوں کے ہر عالم نمناک میں تم ہو

تم ہی مرے دریا کے کٹاؤ میں بھی شامل
جیسے کہ ہجومِ خس و خاشاک میں تم ہو

تم میری دعا میں، مری ہچکی میں، لبوں پر
ہر لمحۂ طاہر میں، شب پاک میں تم ہو

مجھ میں مری وحشت کے سوا بھی کوئی سایہ
آنکھوں کی چمک چہرہ کی سرخی میں بھی ہو تم

اشہر ہاشمی
۴۰۱، ۵۱ کشن کنج، ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی
موبائل: 8447623857

ادبی اور فلمی دنیا کی مشترکہ وراثت
راجندر سنگھ بیدی

محمد عالم
چھوٹی مسجد، جمال پور، علی گڑھ
موبائل: 8115382611

فن اردو افسانہ نگاری میں پریم چندر، کرشن چندر اور منٹو کے بعد چوتھی بڑی شخصیت راجندر سنگھ بیدی کی ہے اور یہ بات بھی مسلم ہے کہ ہمارے بعض شعراء و ادبا ادبی دنیا کے ساتھ فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے ہیں۔

۱۹۴۰ء تک فلمی دنیا میں شاعروں اور ادیبوں کی خاصی کمی رہی لیکن دھیرے دھیرے فلمی دنیا میں ادیبوں اور شاعروں کی مانگ بڑھتی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فلمی دنیا کے دروازے دوسری زبانوں کے ادیبوں کی طرح اردو ادیبوں کے لئے بھی وا ہوتے چلے گئے اور پوری فلم انڈسٹری بے شمار نغمہ نگاروں، کہانی، منظرنامے، افسانے لکھنے والوں ادیبوں اور شاعروں سے روشن نظر آنے لگی۔ خاص کر ترقی پسند شعراء و ادبا میں خواجہ احمد عباس، کرشن چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی وغیرہ پیش پیش تھے۔

یوں تو بہت سے ادیب فلمی دنیا میں آئے اور چلے گئے لیکن راجندر سنگھ بیدی جس شان و شوکت سے آئے اور فلمی دنیا میں چھا گئے یہ کم ادیبوں کو نصیب ہوا ہوگا۔

مکالمہ نگاری کے فروغ میں فلمی دنیا کی اہمیت سے کسی طور پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مکالمے کسی بھی فلم کو اس کے عروج تک پہنچانے اور دلچسپ بنانے میں بہت اہمیت کے حامل ہوا کرتے ہیں۔ فلمی دنیا میں ہمیشہ سے بہتر اور پر اثر مکالمہ نگاری کے لئے اردو ادیب کی ہر دور میں اہمیت رہی ہے کیونکہ فلموں میں تفریح کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کی بھی بنیادی اہمیت ہے۔ فلموں میں راجندر سنگھ بیدی نے نہ صرف مکالمے بلکہ منظرنامے بھی لکھے، یہی وجہ ہے کہ اردو مکالموں کو مقبولیت کا شرف

راجندر سنگھ بیدی جب فلمی دنیا میں آئے تو ان کی شہرت ان سے پہلے وہاں پر ہو چکی تھی۔ فلمی دنیا کے اردو جاننے والے اور پنجابی حلقوں میں اکثر لوگ راجندر سنگھ بیدی کے نام سے واقف تھے۔
۱۹۴۹ء کو جب بیدی پہلی بار بمبئی پہنچے تو ان کے دوست امر کمار کے بہت اصرار کرنے پر ان کے ساتھ 'فینس پکچر کمپنی' گئے اور وہاں فلم ساز ڈی ڈی کشیپ سے ملاقات کرائی، ملاقات ہونے کے بعد ڈی ڈی کشیپ نے امر کمار کو الگ بلا کر پوچھا کہ کیا یہ وہی راجندر سنگھ بیدی ہیں جو کہانیاں لکھتے ہیں؟ امر کمار کی طرف سے ہاں میں جواب ملنے پر ڈی ڈی کشیپ نے چھ سو روپے کی ملازمت کی پیشکش کی۔

عطا کرنے میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔

راجندر سنگھ بیدی جب فلمی دنیا میں آئے تو ان کی شہرت ان سے پہلے وہاں پر ہو چکی تھی۔ فلمی دنیا کے اردو جاننے والے اور پنجابی حلقوں میں اکثر لوگ راجندر سنگھ بیدی کے نام سے واقف تھے۔

۱۹۴۹ء کو جب بیدی پہلی بار بمبئی پہنچے تو ان کے دوست امر کمار کے بہت اصرار کرنے پر ان کے ساتھ 'فینس پکچر کمپنی' گئے اور وہاں فلم ساز ڈی ڈی کشیپ سے ملاقات کرائی، ملاقات ہونے کے بعد ڈی ڈی کشیپ نے امر کمار کو الگ بلا کر پوچھا کہ کیا یہ وہی راجندر سنگھ بیدی ہیں جو کہانیاں لکھتے ہیں؟ امر کمار کی طرف سے ہاں میں جواب ملنے پر ڈی ڈی کشیپ نے چھ سو روپے کی ملازمت کی پیشکش کی لیکن بیدی نے چھ سو روپے کو کمتر جانا اور ہزار روپے کی مانگ کر دی، لیکن ڈی ڈی کشیپ کے لئے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ اس وقت کے مشہور و معروف ادیب و شاعر قمر جلال آبادی، راجندر کرشن چھ سو روپے کی ہی ملازمت پر مامور تھے اور انہیں اس قدر امتیازی درجہ نہیں دیا جاسکتا تھا۔ بالآخر وہ واپس چلے آئے۔ واپس آنے کے بعد امر کمار اور ان کی بیوی نے خوب شور مچایا اور نہایت سست کہا لیکن دیکھئے کہ تیسرے دن خود ڈی ڈی کشیپ نے ایک آدمی بھیج کر بلوایا اور ہزار روپے ماہانہ قبول کیا اور پھر انہوں نے پہلی فلم 'بڑی بہن' کا منظرنامہ اور مکالمہ لکھا، اس فلم میں گیتا بالی، روپ کمل، پران، ثریا وغیرہ نے منفرد کردار نبھایا۔ نغمے قمر جلال آبادی اور راجندر کرشن نے لکھے، جس کو محمد رفیع اور لتا منگیشکر اور ثریا نے اپنی آواز دی۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی لیکن ہزار روپے ماہانہ ملازمت کی وجہ سے کمپنی کے دوسرے ادیبوں کو یہ بات بری لگی اور ان کو احساس کمتری کا احساس ہونے لگا جس کی وجہ سے ان کی مخالفت ہونے لگی۔ ایسے ناموافق حالات میں فلم جب مکمل ہو کر منظر عام پر آئی

تو کہیں بیدی کا نام نہ تھا بجائے ان کے قمر جلال آبادی اور راجندر کرشن کے نام تھے۔ بیدی کی دوسری کامیاب فلم 'داغ' تھی جو ۱۹۵۲ء کو منظر عام پر آئی جس کو بنگالی ہدایت کار رامیہ چکروتی نے ہدایت کی تھی۔ اس فلم کے ہیرو دلیپ کمار اور ہیروئن نمی تھیں اور دوسرے کرداروں میں اوشا اور للتا پوار وغیرہ نے اہم کردار نبھایا تھا۔ میوزک جے کشن اور نغمے حسرت جے پوری اور شیلندر نے لکھے تھے، جس کو لتا منگیشکر اور طلعت محمود نے گایا تھا۔ یہ فلم عامیانہ روش سے ہٹ کر تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس فلم کے بعد بیدی کا شمار فلمی دنیا کے بہترین اور مستند مکالمہ نگاروں میں ہونے لگا۔

اس فلم کی کامیابی کے بعد ہدایت کاروں نے بیدی سے رجوع کیا لیکن بیدی نے صرف پیسے کی غرض سے بھی مکالمے نہیں لکھے اور اپنا ادبی مقام قائم رکھا۔ بقول خواجہ احمد عباس:

''بیدی صاحب کی لکھی ہوئی فلمیں سلور جبلی ہٹ بھی ہوئیں مگر انہوں نے تجارتی رنگ ڈھنگ بھی نہیں اپنایا۔ ان کا ادبی مقام قائم رہا اور جب تک ان کو کہانی یا ڈائرکٹر نے متاثر نہیں کیا انہوں نے صرف پیسے کی غرض سے کبھی مکالمے یا منظر نامے نہیں لکھے۔ اس طرح فلمی دنیا میں رہتے ہوئے بھی بیدی صاحب نے اپنا ادبی وقار اور مقام کبھی نہیں کھویا۔''

(بیدی صاحب کی فلمی زندگی، خواجہ احمد عباس، عصر آگہی، راجندر سنگھ بیدی خصوصی شمارہ، ص ۱۶۵)

فلم 'داغ' کی کامیابی کے بعد ان کی شہرت مشہور بنگالی فلم ساز بمل رائے تک پہنچی، بمل رائے اس وقت فلم 'دیوداس' کو دوبارہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور پھر انہوں نے مکالمہ نگاری کا کام بیدی کے سپرد کیا۔ راجندر سنگھ بیدی نے اس فلم میں بہترین مکالمے لکھے اور جب یہ فلم منظر عام پر آئی تو عوام وخواص دونوں حلقوں میں خوب پسند کی گئی۔ اس فلم میں سہگل کے کردار کو دوبارہ اپنی مخصوص اور دلفریب اداکاری سے دلیپ کمار نے جلا بخشی اور بیدی کے ادبی رنگ میں ڈوبے ہوئے مکالموں نے نئی روح پھونک دی۔ اس طرح بیدی کے مراسم بمل رائے سے بڑھتے گئے اور دوبارہ انہیں کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم

فلم 'داغ' کی کامیابی کے بعد ان کی شہرت مشہور بنگالی فلم ساز بمل رائے تک پہنچی، بمل رائے اس وقت فلم 'دیوداس' کو دوبارہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے اور پھر انہوں نے مکالمہ نگاری کا کام بیدی کے سپرد کیا۔ راجندر سنگھ بیدی نے اس فلم میں بہترین مکالمے لکھے اور جب یہ فلم منظر عام پر آئی تو عوام وخواص دونوں حلقوں میں خوب پسند کی گئی۔ اس فلم میں سہگل کے کردار کو دوبارہ اپنی مخصوص اور دلفریب اداکاری سے دلیپ کمار نے جلا بخشی اور بیدی کے ادبی رنگ میں ڈوبے ہوئے مکالموں نے نئی روح پھونک دی۔ اس طرح بیدی کے مراسم بمل رائے سے بڑھتے گئے اور دوبارہ انہیں کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم 'مدھومتی' کے مکالمے بھی لکھے۔ اس کے ہیرو بھی دلیپ کمار تھے، ہیروئن کا کردار وی جینتی مالا نے نبھایا تھا اور دوسرے کرداروں میں جانی واکر اور پران وغیرہ تھے۔ یہ ایک رومانی فلم تھی، اس فلم میں بھی راجندر سنگھ بیدی نے ادبی معیار کو قائم رکھا۔ اس فلم کے ذریعہ بیدی کو فلم فیئر بسٹ ڈائلاگ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

'مدھومتی' کے مکالمے بھی لکھے۔ اس کے ہیرو بھی دلیپ کمار تھے، ہیروئن کا کردار وی جینتی مالا نے نبھایا تھا اور دوسرے کرداروں میں جانی واکر اور پران وغیرہ تھے۔ یہ ایک رومانی فلم تھی، اس فلم میں بھی راجندر سنگھ بیدی نے ادبی معیار کو قائم رکھا۔ اس فلم کے ذریعہ بیدی کو فلم فیئر بسٹ ڈائلاگ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

بمل رائے سے اچھے مراسم ہونے کی وجہ سے ان کے ذریعہ رشی کیش مکھرجی سے بھی ان کے تعلقات قائم ہو گئے جو اس وقت بمل رائے کے معاون ہدایت کار تھے اور جب رشی کیش بمل رائے سے علیٰحدہ ہو کر خود فلمیں بنانے لگے تو راجندر سنگھ بیدی مستقل طور پر ان سے وابستہ ہو گئے اور پھر انہوں نے رشی کیش مکھرجی کے لئے تقریباً ۱۰۔۱۲ کہانیاں لکھیں، جن میں انوراھا، انوپما اور ستیہ کام جیسی کامیاب فلمیں تھیں۔ فلم ستیہ کام کو بسٹ فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

بیدی کی کامیاب اور منفرد فلموں میں 'مرزا غالب' کا اہم نام ہے۔ یوں تو مرزا غالب سعادت حسن منٹو نے لکھی تھی لیکن ان کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکی، جس کی تکمیل بیدی نے کی۔ اس فلم کا ایک مضبوط پہلو فلم کی موسیقی تھی جس کے موسیقار غلام محمد تھے۔ اس فلم میں غالب ہی کی غزلوں کو بطور نغمہ فلمایا گیا تھا جیسے 'آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک'، 'دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے'، 'عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی'، 'یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا'، 'نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے' وغیرہ۔

اس کہانی کو منٹو نے بہت تحقیق اور کاوش سے لکھا تھا لیکن پاکستان ہجرت کرنے کی وجہ سے غالب پر فلم بنانے کا خواب پورا نہ ہو سکا لیکن جہاں منٹو نے اس فلم کی کہانی لکھی وہیں بیدی نے اپنے ادبی اور پرشکوہ مکالموں سے جان ڈال دی۔ اس فلم کے مرکزی کردار کو بھارت بھوشن اور ہیروئن کا کردار مشہور اداکارہ وگلوکارہ ثریا نے نبھایا تھا اور فلم کے نغموں کو زبان بھی دی۔ یہ فلم عوام وخواص دونوں حلقوں میں کافی مقبول رہی۔

جہاں راجندر سنگھ بیدی کی کامیاب فلمیں بھی ہیں وہیں ان کی ناکام فلمیں بھی تھیں جب کہ وہ فلمیں بیدی کے شاہکار افسانوں پر مبنی تھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر اچھے شاہکار افسانے پر بنی ہوئی فلم کامیاب ہو

لہٰذا اس کا خمیازہ بیدی کو بھگتنا پڑا۔ 'پھاگن'، 'رنگولی' اور 'گرم کوٹ' وغیرہ ان کی فلاپ فلموں میں سے تھیں۔ 'گرم کوٹ' کے ناکام ہونے پر اپنے دوست اوپندر ناتھ اشک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''گرم کوٹ کی وجہ سے اپنے ادارے کو ستر ہزار کا گھاٹا پڑا۔ لمیٹیڈ ادارہ ہونے کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر تو کوئی خسارہ نہیں لیکن اتنا ضروری ہے کہ اپنی محنت رائیگاں گئی۔''

(مکاتیب بیدی، اوپندر ناتھ اشک، خصوصی شمارہ، عصر آگہی، ص ۲۲۷)

لیکن راجندر سنگھ بیدی کو سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ اب ان سے فلم ساز کترانے لگے تھے، ان کی ایک فلاپ فلم 'پھاگن' جو ۱۹۷۳ء کو منظر عام پر آئی۔ انہوں نے یہ فلم اپنے بیٹے نریندر بیدی کے بہت اصرار پر ایک کمرشیل فلم لکھی تھی اور خود ہدایت کاری کے کام انجام دئے تھے۔ یہ فلم فنی اور کامرشیل دونوں اعتبار سے فلاپ رہی جب کہ دھرمیندر، وحیدہ رحمن اور جیا بہادری نے ناقابل فراموش کردار ادا کئے تھے۔ نغمے مجروح سلطانپوری نے لکھے تھے جس کو کشور کمار، لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے نے اپنی اپنی آواز دی تھی لیکن یہ فلم فلم بینوں کے لئے موثر اور جاذب نظر نہ رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آفس بھی اپنے تمام ساز وسامان کے ساتھ بک گیا اور کافی عرصے تک کوئی نئی فلم بنانے کے لئے خود کو تیار نہ کر سکے۔

۱۹۶۲ء کو منظر عام پر آنے والی فلم 'رنگولی' کا بھی وہی حشر ہوا جو دیگر فلموں کا ہوا۔ اس فلم کے ڈائرکٹر امر کمار تھے۔ یہ فلم راجندر سنگھ بیدی اور امر کمار کے مالی اشتراک سے بنی تھی، اس میں ہیرو کا کردار کشور کمار اور ہیروئن کا کردار وی جینتی مالا نے نبھایا تھا اور میوزک جئے کشن نے دئے تھے۔ اس فلم کی ناکامی کے باعث راجندر سنگھ بیدی کو ۸۰ ہزار روپے کا بڑا نقصان سہنا پڑا لیکن برابر ناکامیوں پر بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ فلم کے فلاپ ہونے پر وہ کبھی گھبراتے نہیں تھے بلکہ ہمیشہ ان کے چہرے پر خوشی جھلکتی دکھائی دیتی تھی۔ بقول یوسف ناظم:

''یہ وہی راجندر بیدی ہیں جو اپنی بنائی ہوئی کسی فلم کے ناکام ہونے پر خوشی سے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے میرا تو بال بال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ پھر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور اصرار کرتے، جی ہاں، بال بال''

(جادوگر بیدی، یوسف ناظم، رسالہ آج کل، فروری ۱۹۸۵ء)

متواتر فلم کی ناکامی اور مالی نقصان کی وجہ سے فلم سازی کے میدان میں بیدی نے دوسرا قدم بہت سنبھل کر اور تھوڑی تاخیر سے اٹھایا۔ ۹۔۸ سال کے بعد ۱۹۷۰ء میں اپنے ڈراموں کے مجموعہ 'سات کھیل' کے ایک ڈرامہ 'نقل مکانی' کو 'دستک' کے نام سے فلمایا اور خود ہدایت کاری کے فرائض انجام دئے۔ فلم کا مرکزی کردار سنجیو کمار اور ریحانہ سلطانہ نے نبھایا۔

اس فلم میں ایک مسلم شادی شدہ جوڑے کو دکھایا گیا جو ایک ایسے علاقہ میں مکان کرایہ پر لیتا ہے جو بازار حسن ہے اور جو مکان کرائے پر لیتا ہے وہ کسی طوائف کا کوٹھا ہوتا ہے۔ لوگ اس فلم کی ہیروئن ریحانہ سلطانہ کو بھی ایک طوائف سمجھ کر تماش بینی کے لئے آنے لگتے ہیں، تانک جھانک، آوازیں کسنا لوگوں کا معمول بن جاتا ہے۔

اس بات سے مسلم جوڑے کو جو ذہنی اذیت پہنچتی ہے، راجندر سنگھ بیدی نے اس کی عکاسی نہایت موثر انداز میں کی ہے۔

متواتر فلم کی ناکامی اور مالی نقصان کی وجہ سے فلم سازی کے میدان میں بیدی نے دوسرا قدم بہت سنبھل کر اور تھوڑی تاخیر سے اٹھایا۔ ۹۔۸ سال کے بعد ۱۹۷۰ء میں اپنے ڈراموں کے مجموعہ 'سات کھیل' کے ایک ڈرامہ 'نقل مکانی' کو 'دستک' کے نام سے فلمایا اور خود ہدایت کاری کے فرائض انجام دئے۔ فلم کا مرکزی کردار سنجیو کمار اور ریحانہ سلطانہ نے نبھایا۔ اس فلم میں ایک مسلم شادی شدہ جوڑے کو دکھایا گیا جو ایک ایسے علاقہ میں مکان کرایہ پر لیتا ہے جو بازار حسن ہے اور جو مکان کرائے پر لیتا ہے وہ کسی طوائف کا کوٹھا ہوتا ہے۔ لوگ اس فلم کی ہیروئن ریحانہ سلطانہ کو بھی ایک طوائف سمجھ کر تماش بینی کے لئے آنے لگتے ہیں، تانک جھانک، آوازیں کسنا لوگوں کا معمول بن جاتا ہے۔ اس بات سے مسلم جوڑے کو جو ذہنی اذیت پہنچتی ہے، راجندر سنگھ بیدی نے اس کی عکاسی نہایت موثر انداز میں کی ہے۔

یہ فلم تجارتی اعتبار سے خاصی کامیاب فلم رہی اور فنی اعتبار سے تحیر آمیز اور تجرباتی فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کے ذریعہ سنجیو کمار اور ریحانہ سلطانہ کو نیشنل ایوارڈ میں اس سال کا بہترین اداکار اور اداکارہ کے انعام سے نواز اگیا اور مدن موہن جو اس فلم کے موسیقار تھے، ان کو اس سال کا بہترین میوزک ڈائرکٹر کا ایوارڈ ملا۔ اس فلم کے سارے نغمے مجروح سلطانپوری نے لکھے۔

لیکن المناک بات یہ ہے کہ راجندر سنگھ بیدی کی فنکارانہ حیثیت تسلیم نہیں کی گئی جب کہ عوام سے لے کر خواجہ احمد عباس، رشی کیش مکھرجی، یوسف خاں وغیرہ جیسے دانشوروں نے ہدایت کاری اور فکر انگیزی کو فلم سازی کی تاریخ میں قابل قدر اضافے کی حیثیت سے جانا۔ خواجہ احمد عباس نے تو یہاں تک لکھا:

''اس زمانے میں 'فلم فورم' فلم سوسائٹی نے نئے ہدایت کاروں کو پھالکے ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کر دیا ہوتا تو بیدی صاحب کو یقینی طور پر اس سال کا بہترین نیا ہدایت کار مانا جاتا۔''

(بیدی صاحب کی فلمی زندگی، خواجہ احمد عباس، عصر آگہی،

راجندر سنگھ بیدی خصوصی شمارہ، ص ۱۶۵)

فلم 'دستک' سے بیدی کا شمار بہترین اور مستند ہدایت کاروں میں ہونے لگا اور اسی سال راجندر سنگھ بیدی کو ان کے فلمی خدمات کے اعتراف میں 'پدم شری' کے انعام سے سرفراز کیا گیا۔

۱۹۷۸ء میں بیدی نے اپنی زندگی کی آخری فلم 'آنکھن دیکھی' بنائی۔ یہ فلم نچلے طبقہ ہریجنوں کے استحصال پر مبنی تھی لیکن یہ فلم بیدی کی زندگی میں منظر عام پر نہ آسکی، اس کی وجہ یہ تھی کہ تقسیم کنندگان نے بیدی سے تفریحی ٹیکس معاف کرانے کے لئے کہا۔ اس وقت بیدی نے بیماری کے باوجود ممبئی سے دہلی کے متعدد چکر کاٹے لیکن ٹیکس معاف کرانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ افسروں کی بے توجہی اور بے حسی کی وجہ سے فلم ڈبے میں برسوں بند رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ بیدی کو چھ برس کے لمبے عرصہ تک پریشانی وعذاب سے گزرنا پڑا اور اس فلم کو بیچ پانے کی حسرت لئے ہوئے موت کی آغوش میں چلے گئے۔

اس کے علاوہ بیدی کا مشہور ومعروف اور اکلوتا ناول 'ایک چادر میلی سی' کا شمار ادب کے بہترین ناولوں میں کیا جاتا ہے۔ جب بیدی نے یہ ناول لکھا تو ادبی اور فلمی حلقہ میں کافی چرچا ہوا۔ مشہور زمانہ ہیروئن گیتا بالی کو اس قدر پسند آیا کہ خود پیسہ لگا کر اور خود ہیروئن کا کردار نبھا کر یہ فلم بنانا چاہی تھی۔ فلم کی ابتدا بھی ہوچکی تھی اور اس فلم کا نام 'رانو' رکھا، جو اس ناول کا لافانی کردار ہے لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ بعد میں پاکستان کی مشہور اداکارہ وہدایت کار سنگیتا نے 'مٹھی بھر چاول' کے نام سے فلم بنائی۔ اس فلم میں کہانی کا بیشتر حصہ تو اسی طرح فلمایا، مکالمے بھی اسی طرح رہنے دیئے لیکن کہانی کے

راجندر سنگھ بیدی کو فلمی دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ اپنے مرنجان مرنج کردار کی وجہ سے مقبول ترین ہستیوں میں سے ایک تھے۔
بقول ہنس راج رہبر:
''بیدی بلاشبہ اچھے انسان تھے۔ فلم انڈسٹری میں ان کی بہت عزت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے شرافت، سنجیدگی اور نیک نیتی پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ انہوں نے جو ڈائیلاگ لکھے ان سے بیدیت صاف جھلکتی ہے۔ 'گرم کوٹ'، 'پھاگن' فلموں پر ان کے کرداروں کی چھاپ ہے لیکن فلم سے الگ ہوکر ادب کے لئے وقف کرنے کی حسرت پوری نہ ہوئی۔''
(رسالہ آج کل، فروری، ۱۹۸۵ء)

آخری حصے میں کچھ تبدیلیاں کرکے اسے اور ڈرامائی بنا دیا اور فلم کامیاب بھی رہی۔

بیدی نے اپنی انتیس سالہ فلمی زندگی کی وابستگی کے دوران کل ملا کر تقریباً ۴۰ فلموں کے مکالمے لکھے اور ۲۰ سے زائد فلموں کے منظر نامے بھی لکھے۔

راجندر سنگھ بیدی کو فلمی دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ اپنے مرنجان مرنج کردار کی وجہ سے مقبول ترین ہستیوں میں سے ایک تھے۔ بقول ہنس راج رہبر:

''بیدی بلاشبہ اچھے انسان تھے۔ فلم انڈسٹری میں ان کی بہت عزت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے شرافت، سنجیدگی اور نیک نیتی پر کبھی حرف نہیں آنے دیا۔ انہوں نے جو ڈائیلاگ لکھے ان سے بیدیت صاف جھلکتی ہے۔ 'گرم کوٹ'، 'پھاگن' فلموں پر ان کے کرداروں کی چھاپ ہے لیکن فلم سے الگ ہوکر ادب کے لئے وقف کرنے کی حسرت پوری نہ ہوئی۔''

(رسالہ آج کل، فروری، ۱۹۸۵ء)

اب مضمون کے نقطۂ اختتام تک پہنچتے پہنچتے یہ بات قطعی وضاحت طلب نہیں رہ جاتی ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نہ صرف ادبی خدمات کے حوالے سے ایک معتبر ومستند نام ہے بلکہ اپنے ادبی وقار کو مجروح کئے بغیر انہوں نے جو فلم انڈسٹری میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے حوالے سے بھی انہیں فلمی دنیا میں یاد کیا جاتا رہے گا۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی. ایف. ایس. سی. اور برانچ کوڈ بھی ارسال کریں۔

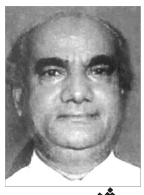

شفیق احمد
سائرہ منزل، نوایت نگر، نالاسوپارا، تھانے
موبائل: 9323534572

کرشن چندر کا سفر
افسانہ نگاری سے فلم نویسی تک

ترقی پسند ادیبوں میں اگر کسی نے سب سے زیادہ افسانے، ناول اور طنز ومزاح کے مضامین لکھے ہیں، وہ کرشن چندر تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایشیا کے سب سے بڑے مصنف تھے۔ حالانکہ ان کا زیادہ تر وقت رسالوں کے لئے افسانے اور پبلشروں کے لئے ناول لکھنے میں گزرتا تھا مگر پھر بھی وہ اپنے فلمی دوستوں کے لئے کہانیاں اور مکالمے لکھنے کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔

کرشن چندر ۲۳؍نومبر ۱۹۱۴ء کو پنجاب کے شہر جبراں والا کے قصبے وزیر آباد (حال پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر گوری شنکر وزیر آباد کی اہم شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ۱۹۱۸ء میں ان کے والد گوری شنکر جی کا تقرر میڈیکل آفیسر کشمیر کی علاقائی ریاست پونچھ میں ہوا اور وہیں سے وہ سبکدوش ہوکر دہلی آ گئے تھے۔ کرشن چندر کی ابتدائی تعلیم مینڈر (کشمیر) کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ انہوں نے آٹھویں جماعت وکٹوریہ جبلی ہائی اسکول پونچھ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کرسچن کالج، لاہور میں داخلہ لیا اور سائنس کے مضامین لے کر انٹر کا امتحان پاس کیا۔

کرشن چندر کے والد ان کو اپنی طرح ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے لیکن کرشن چندر کا رجحان سیاست، تاریخ، معاشیات اور ادب کی طرف تھا۔ چنانچہ بی اے میں انہوں نے یہی مضامین لئے۔ ۱۹۳۴ء میں بی اے کر لینے کے بعد انہوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور اس کے بعد لاہور کے کالج سے ۱۹۳۷ء میں ایل ایل بی کی ڈگری لی۔

طالب علمی کے دوران کرشن چندر بیمار ہو گئے اور اسپتال میں داخل ہوئے۔ یرقان کی وجہ سے انہوں نے مریضوں کی دکھ بھری حالت دیکھی اور اپنی حالت سے بھی وہ خوش نہیں تھے۔ اسپتال کے بستر پر پڑے پڑے وہ بڑی اکتاہٹ سی محسوس کر رہے تھے۔ اس اکتاہٹ اور بوریت کو دور کرنے کے لئے انہوں نے ایک افسانہ 'یرقان' لکھا اور لاہور کے ایک رسالے 'ادب دنیا' کو بھیج دیا۔ وہ افسانہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس طرح کرشن چندر افسانے لکھنے کی طرف راغب ہو گئے اور پھر یہ سلسلہ ان کی زندگی کی آخری سانس تک چلا۔

کرشن چندر کو بچپن ہی سے اردو ناولوں اور داستانوں کو پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کے والد ان سے کہا کرتے تھے کہ ناول پڑھ کر اپنا وقت برباد مت کرو بلکہ اپنے اسکول کے کورس کی کتابوں پر زیادہ توجہ دو لیکن کرشن چندر کو داستانیں پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ والد کی موجودگی میں درسی کتابیں پڑھتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں الف لیلیٰ کے قصے۔

ایل ایل بی کے بعد کرشن چندر نے انگریزی میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ان کی نوعیت سیاسی اور معاشی ہوتی تھی اور وہ لاہور کے مشہور انگریزی روزنامہ 'ٹریبون' میں شائع ہوتے تھے۔

کرشن چندر کو بچپن ہی سے اردو ناولوں اور داستانوں کو پڑھنے کا شوق تھا۔ ان کے والد ان سے کہا کرتے تھے کہ ناول پڑھ کر اپنا وقت برباد مت کرو بلکہ اپنے اسکول کے کورس کی کتابوں پر زیادہ توجہ دو لیکن کرشن چندر کو داستانیں پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ والد کی موجودگی میں درسی کتابیں پڑھتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں الف لیلیٰ کے قصے۔ ایل ایل بی کے بعد کرشن چندر نے انگریزی میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ ان کی نوعیت سیاسی اور معاشی ہوتی تھی اور وہ لاہور کے مشہور انگریزی روزنامہ 'ٹریبون' میں شائع ہوتے تھے۔ علامہ اقبال کے انتقال کے بعد ۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء کو انہوں نے علامہ اقبال پر ایک خاص تعزیتی مضمون لکھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اگر وہ مستقل طور پر انگریزی میں لکھتے رہتے تو انگریزی زبان کے ایک بڑے قلمکار ہوتے لیکن ان کو اردو میں افسانے لکھنے کا چسکا بھی پڑ چکا تھا اور اس زبان میں لکھنے کے لئے ان کے اندر چھپا ہوا ادیب بے چین ہو رہا تھا۔ پھر وہ انگریزی کو چھوڑ کر پوری طرح اردو میں لکھتے رہے۔

۱۹۳۹ء میں کرشن چندر کو آل انڈیا ریڈیو لاہور میں پروگرامنگ اسسٹنٹ کی ملازمت مل گئی۔ اس کے ایک سال بعد ان کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ہو گیا

جہاں سعادت حسن منٹو پہلے ہی سے ملازم تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد راجہ مہدی علی خاں بھی دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہو گئے تھے۔ وہاں کام کرتے ہوئے کرشن چندر سعادت حسن منٹو اور راجہ مہدی علی خاں گہرے دوست ہو گئے تھے۔ دہلی میں دو سال کے قیام کے بعد کرشن چندر لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر بھیج دئے گئے۔ ریڈیو کی ملازمت کرتے ہوئے کرشن چندر افسانے لکھتے رہے اور ان کے افسانے چھپتے بھی رہے۔ ان دنوں ان کا ایک افسانہ 'سفید خون' پروڈیوسر ڈبلیو زید احمد کی نظر سے گزرا۔ وہ افسانہ پڑھ کر زید احمد نے کرشن چندر کو خط لکھا۔

''میں اپنی ایک فلم کے لئے آپ سے مکالمے لکھوانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ لکھنؤ سے پونے آسکتے ہیں؟''

کرشن چندر ریڈیو کی ملازمت سے خوش نہیں تھے۔ ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے پونے آ گئے اور شالیمار پکچرس میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔ انہوں نے پہلی بار فلم 'من کی جیت' کے مکالمے لکھے۔ اس فلم کے ہیرو شیام تھے اور ہیروئن نینا۔ یہ تبدیلی کرشن چندر کے رجحان کے عین مطابق تھی۔ اگر وہ فلموں میں مکالمے لکھنے کے شوق کی خاطر ریڈیو کی ملازمت ترک نہ کرتے تو وہ ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدے سے رٹائر ہوتے۔

دو سال تک پونے میں شالیمار پکچرس کے مکالمے لکھنے کے بعد کرشن چندر ممبئی آ گئے اور دیوکا رانی کی کمپنی بامبے ٹاکیز سے منسلک ہو گئے۔ فلم کے مکالمے لکھتے لکھتے وہ ہدایت کار کے کام کو بھی غور سے دیکھتے رہے۔ کچھ فلموں کے مکالمے لکھنے کے بعد کرشن چندر کو ڈائرکٹر بننے کا شوق ہوا اور جب وہ شوق جنون کی حد تک بڑھا تو انہوں نے 'نیشنل فلمز' کے اشتراک سے فلم کمپنی قائم کی اور ۱۹۴۷ء میں ایک فلم 'سرائے سے باہر' بنائی۔ وہ اس فلم کے رائٹر، پروڈیوسر اور ڈائرکٹر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مہیندر ناتھ اس فلم کے ہیرو تھے اور سیتا دیوی ہیروئن۔ اس وقت کی مشہور رقاصہ ککو کے اس فلم میں دو ڈانس تھے۔ اس فلم سے انہیں کچھ مالی فائدہ ہوا جس سے متاثر ہو کر انہوں نے اشتراکی کمپنی سے ناطہ توڑ کر 'ماڈرن تھیئٹر' کے نام سے اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی۔ اس کمپنی کی پہلی فلم 'دل کی آواز' تھی اور دوسری فلم 'راکھ' تھی جو آدھی ہی بن پائی تھی۔ ان دونوں فلموں میں بھی ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ ہیرو تھے۔ ان دونوں فلموں سے کرشن چندر کو زبردست مالی نقصان ہوا۔ تب انہیں احساس ہوا کہ فلم سازی اور ہدایت کاری ان کے بس کی بات نہیں اور پھر انہوں نے اپنی ساری توجہ افسانہ نگاری، ناول نگاری اور فلم اسکرپٹ پر مرکوز کر دی۔ ان کی حقیقی زندگی ادبی ہی تھی جس کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا۔ ان کا پہلا ناول 'شکست' ساقی بک ڈپو کی فرمائش پر کشمیر کے گلمرگ ہوٹل میں رہ کر صرف ۲۱ر دن میں لکھا تھا۔ ان کا یہ ناول اتنا مقبول ہوا کہ اس کے کئی ایڈیشن تھوڑی ہی مدت میں چھپ گئے تھے۔

دو سال تک پونے میں شالیمار پکچرس کے مکالمے لکھنے کے بعد کرشن چندر ممبئی آ گئے اور دیوکا رانی کی کمپنی بامبے ٹاکیز سے منسلک ہو گئے۔ فلم کے مکالمے لکھتے لکھتے وہ ہدایت کار کے کام کو بھی غور سے دیکھتے رہے۔
کچھ فلموں کے مکالمے لکھنے کے بعد کرشن چندر کو ڈائرکٹر بننے کا شوق ہوا اور جب وہ شوق جنون کی حد تک بڑھا تو انہوں نے 'نیشنل فلمز' کے اشتراک سے فلم کمپنی قائم کی اور ۱۹۴۷ء میں ایک فلم 'سرائے سے باہر' بنائی۔ وہ اس فلم کے رائٹر، پروڈیوسر اور ڈائرکٹر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مہیندر ناتھ اس فلم کے ہیرو تھے اور سیتا دیوی ہیروئن۔

ان کی کتابیں چھپنے لگی تھیں اور تیزی سے فروخت ہونے بھی لگی تھیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے انہوں نے مصروف زندگی گزاری۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کے ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا جب ان کی کتابیں انگریزی کے علاوہ یورپ کی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئیں۔

۱۹۵۶ء میں ہندوستان کا ایک ثقافتی وفد روس گیا تھا۔ علی سردار جعفری اور خواجہ احمد عباس بھی اس وفد میں شامل تھے۔ حالانکہ کرشن چندر بھی اس وفد کے ساتھ جانے والے تھے لیکن عین وقت پر طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اس وفد کے ساتھ روس نہ جا سکے۔ وفد کے ممبران کو ماسکو کی نیشنل لائبریری میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے لائبریرین نے وفد کو پوری لائبریری دکھائی اور پھر ہندوستانی مصنفین کی کتابوں کا سیکشن بھی دکھایا۔ لائبریرین نے یہ بات بتائی کہ ہندوستان کے کسی ادیب کی اگر سب سے زیادہ کتابیں روسی زبان میں ترجمہ ہوئیں ہیں وہ کرشن چندر تھے۔

ایک بار روس میں ایفروایشین رائٹرس کی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کرشن چندر نے اور پاکستان کی نمائندگی فیض احمد فیض نے کی تھی۔ ایک بڑے ہال میں ایفروایشین رائٹرس بھی بیٹھے تھے اور ان کی میزوں پر ان کے ملک کے جھنڈے بھی لگے ہوئے تھے۔ کرشن چندر اور فیض احمد فیض نے دور سے ایک دوسرے کو دیکھ لیا تھا۔ دونوں مسکرائے اور پھر اپنی اپنی میز سے اپنے جھنڈے اٹھا کر ایک تیسری میز پر آ بیٹھے اور پھر ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں کی دیر تک گفتگو ہوئی۔ فیض احمد فیض نے کرشن چندر کی اس ملاقات پر ایک خصوصی مضمون لکھا جو پاکستان کے ایک رسالے میں چھپنے کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے رسالے 'بیسویں صدی' میں بھی چھپا تھا۔

کرشن چندر نے اپنا بچپن کشمیر میں گزارا تھا اس لئے ان کی کہانیوں میں کشمیر کے حسن کی گہری شاعرانہ چھاپ ہے۔ انہوں نے کشمیر کے بارے میں کتنی ہی خوبصورت کہانیاں اور ناول لکھے ہیں۔ ان کا ناول 'میری یادوں کے چنار' ایسا ناول ہے جس میں انہوں نے کشمیر میں بتائے ہوئے بچپن کے بہت سے دلچسپ واقعات بڑی خوبصورتی سے بیان کئے گئے ہیں۔ 'دوسری برف باری سے پہلے' بھی ان کا ایک ایسا ناول ہے جس میں کشمیر کے موسم سرما کی برف باری کی خوبصورت منظر کشی کی گئی ہے۔

جن دنوں میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا ان دنوں کرشن چندر کا ناول 'ایک گدھے کی سرگزشت' دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ 'شمع' میں سلسلہ وار شائع ہو رہا تھا۔ میں ان دنوں اردو پڑھنے کی مشق کر رہا تھا۔ بچپن ہی میں میں کرشن چندر کے نام سے واقف ہو گیا تھا جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا مجھے کرشن چندر کے افسانے اور ناولوں میں دلچسپی پیدا ہوتی چلی گئی اور جب مجھے ادب کا تھوڑا بہت شعور ہوا تو میں کرشن چندر کا ایک بڑا شیدائی ہو گیا تھا۔ 'ایک گدھے کی سرگزشت' کے بعد گدھے پر ان کا دوسرا ناول 'ایک گدھے کی واپسی' اور اسی سیریز کا تیسرا ناول 'ایک گدھا نیفا میں' یہ تینوں ناول طنز و مزاح کی صنف میں شاہکار ناول سمجھے جاتے ہیں۔

کرشن چندر افسانہ نگاری کے فن میں ماہر تھے۔ دنیا کے ہر موضوع پر سیاست، ادب، ڈرامہ، رومانس، اسکینڈل یا گھریلو گپ شپ میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے۔ ان کے دوست ان کو عام معلومات کا انسائیکلو پیڈیا کہتے تھے۔

ایک ازبیک خاتون رانو قامیوموا کو جو تاشقند یونیورسٹی میں اردو پڑھاتی تھیں، ماسکو بھیجا گیا جہاں انہوں نے کرشن چندر کے افسانوں اور ناولوں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر احمد حسن نے کرشن چندر کے فن اور شخصیت کا مطالعہ کیا اور کرشن چندر پر تحقیقی مقالہ لکھ کر الہ آباد یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۶۸ء میں ممبئی سے 'جشن کرشن چندر' منایا گیا جس میں ہندوستان کے بیشتر ترقی پسند ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ اسی جشن میں وزیر اعظم اندرا گاندھی مہمان خصوصی تھیں۔ ساحر لدھیانوی نے اس جشن میں کرشن چندر کی شخصیت پر ایک نظم پڑھی تھی۔ کسی ادیب کے اعزاز میں اتنا بڑا جشن نہ پہلے منعقد ہوا اور نہ بعد میں۔

کرشن چندر اپنے دل کی تسکین کے لئے افسانے اور ناول لکھتے تھے لیکن گھر کا کچن چلانے کے لئے وہ فلموں کے مکالمے لکھنے کا کام قبول کر لیتے تھے۔ وہ پروڈیوسروں کے پاس کام مانگنے نہیں جاتے۔ جو پروڈیوسر ان کے گھر آ کر ان سے فلم لکھوانا چاہتے اور ان کی مرضی کے مطابق معاوضہ دیتے، ان کا کام وہ ضرور کر دیتے تھے۔

کرشن چندر نے اپنے دو ناولوں 'فٹ پاتھ کے فرشتے' اور 'پانچ لوفر' کی کہانیوں کو ملا کر ایک فلم اسکرپٹ لکھی تھی جس پر ایک پروڈیوسر فلم بنانے کا خواہشمند تھا لیکن ان کی اچانک موت کی وجہ سے وہ فلم نہ بن سکی تھی۔

کرشن چندر کی ایک طویل کہانی 'انّ داتا' پر انڈین پیپلیز تھیٹر ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۶ء میں ایک فلم 'دھرتی کے لال' بنائی۔ خواجہ احمد عباس اس فلم کے مکالمہ بھی لکھے نویس اور ہدایت کار تھے۔ کرشن چندر کی ایک اور کہانی پر خواجہ احمد عباس نے فلم 'ہمارا گھر' بنائی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں کرشن چندر نے فلم 'اجی بس شکریہ' کے مکالمے تھے۔ اس فلم میں سریش اور گیتا بالی کے علاوہ جانی واکر اور شوبھا کھوٹے نے کام کیا تھا۔ یہ فلم اپنے مکالموں کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی تھی۔ شمی کپور اور فریالی کی فلم 'برادری' میں بھی ان کے مکالمے تھے۔ یوں تو کرشن چندر نے پچاس سے زیادہ فلموں کے مکالمے لکھے۔ ان میں ممتا، شرافت، دو چور، منچلی، ہمراہی، چمبل کی رانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کرشن چندر اپنے دل کی تسکین کے لئے افسانے اور ناول لکھتے تھے لیکن گھر کا کچن چلانے کے لئے وہ فلموں کے مکالمے لکھنے کا کام قبول کر لیتے تھے۔ وہ پروڈیوسروں کے پاس کام مانگنے نہیں جاتے۔ جو پروڈیوسر ان کے گھر آ کر ان سے فلم لکھوانا چاہتے اور ان کی مرضی کے مطابق معاوضہ دیتے، ان کا کام وہ ضرور کر دیتے تھے۔ کرشن چندر نے اپنے دو ناولوں 'فٹ پاتھ کے فرشتے' اور 'پانچ لوفر' کی کہانیوں کو ملا کر ایک فلم اسکرپٹ لکھی تھی جس پر ایک پروڈیوسر فلم بنانے کا خواہشمند تھا لیکن ان کی اچانک موت کی وجہ سے وہ فلم نہ بن سکی تھی۔ بعد میں سلمیٰ صدیقی کے صاحبزادے آر کے منیر نے ۱۹۸۱ء میں کرشن جی کی اس اسکرپٹ پر فلم 'یہاں سے شہر کو دیکھو' بنائی تھی جس میں رضا مراد، مہندر سندھو اور ایک نئی لڑکی کومل نے کام کیا تھا۔ کرن کھیر کی یہ پہلی فلم تھی۔ یہ خاکسار اس فلم میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ اس میں دو گیت تھے۔ ایک گیت مجروح سلطانپوری نے لکھا تھا اور ایک گیت راہی معصوم رضا نے۔

۱۹۷۶ء میں کرشن چندر کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔ انہوں نے باہر آنا جانا بند کر دیا تھا۔ ۸/مارچ ۱۹۷۷ء کو کرشن چندر نے اپنی زندگی کی آخری سانس پوری کی۔ ان کی موت سے اردو ادب میں ایک خلا پیدا ہو گیا جو آج تک پر نہیں ہو سکا۔ افسانہ نگاری ناول نگاری اور مکالمہ نویسی میں کرشن چندر نے جو چھاپ چھوڑی تھی وہ فن ادب اور فلمی شائقین کے لئے مشعل راہ ہے۔

❑❑❑

غزل

بھیگے تکئے ہیں اور پلکوں پہ نمی چپکی ہے
شب سرابوں کے تعاقب میں کہیں گزری ہے

عمر بھر لے کے پھری صحرا نوردی مجھ کو
ریت ہی ریت میرے جسم سے اب جھڑتی ہے

اب تو ہر درد ترے ہجر سے جڑ جاتا ہے
کہیں سے اٹھے گھٹا آ کے وہیں برسی ہے

اس کا شہزادہ ابھی تک نہیں واپس آیا
وہ تو نانی کی کہانی میں کہیں اٹکی ہے

اب نہ بچپن نہ وہ بچپن کے پرانے ساتھی
بارشیں ہیں وہی کاغذ کی وہی کشتی ہے

وہ جو ملتا ہے تو احسان سمجھ لے اس کا
نیک بندہ ہے نگاہوں میں خدا ترسی ہے

کیسے سمجھے وہ ترے شہر کے آداب و شعور
تارؔا، کم عقل ہے اور گاؤں کی وہ لڑکی ہے

تارؔا اقبال
ایم۔اقبال شیخ، پناہ ولا، علی نگر، رائے بریلی
موبائل: 943022169

غزل

تو مسکرائے تو اے دوست مسکرائے غزل
نہیں تو غم کے سمندر میں ڈوب جائے غزل

نہ جانے کتنی ہی اوصاف ہو گئیں رائج
بڑی ہی شان سے اب بھی ہے سر اٹھائے غزل

غزل کا لطف حقیقت میں تب ہی آتا ہے
غزل کے لہجے میں جب کوئی گنگنائے غزل

غم جہاں سے کسی دل کو اب نجات نہیں
تو ایسے حال میں کون اب سنے سنائے غزل

سحر سے شام ہوئی، شام سے ہوئی ہے سحر
نہ جانے کس لئے بیٹھی ہے سر جھکائے غزل

زمانے بھر کے غموں کو چھپائے رہتی ہے
کہاں ہے ایسی کوئی جیسی ہے ردائے غزل

تمہاری اس سے رفاقت ضرور ہے اخترؔ
تمہاری بات چلے اور مسکرائے غزل

سلیم اخترؔ
۴۳۶، شیخ سرائے، سیتاپور
موبائل: 7499093303

آخری فریم

مشرف عالم ذوقی
305، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی
موبائل: 9899583881

اُس کا مرنا طے تھا——

لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ جینا چاہتا تھا——

اور مشکل یہ تھی کہ پچھلے تین چار دنوں سے لگاتار ملک الموت اُسے پریشان کر رہا تھا——

'سب سے مل لو۔'

'کیوں؟'

'کیونکہ گڈ بائی، خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے——'

'ابھی تو میں.....ابھی کیوں.....؟'

اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی چالی بیالیس سال۔ یعنی ایسی عمر، جہاں پہنچ کر جوان رہنے کا احساس کچھ زیادہ ہی آپ کو پریشان کرنے لگتا ہے——

'عمر سے کیا ہوتا ہے.....؟ ملک الموت ہنسا۔

'ہوتا کیوں نہیں ہے——'

''نہیں ہوتا'' ملک الموت سنجیدہ تھا۔ 'شکر کرو۔ پہلے آ گیا، موقع دے رہا ہوں—— مرنے کا الہام سب کو نہیں ہوتا۔ وصیت کر جاؤ۔ سب کو بلا لو..... بیٹے کو، بیٹی کو.....بیوی کو.....'

'ڈراؤ مت۔'

'میں ڈرا نہیں رہا۔ احساس کرا رہا ہوں—— تم مرنے والے ہو اور.....'

'نہیں، اب میں جینا چاہتا ہوں۔'

ملک الموت ہنسا—— 'پاگل مت بنو۔ مرنے کی دعا مانگتے مانگتے تم نے ہی مجھے بلایا ہے۔' وہ ہنسا—— تمہاری دعا سن لی گئی۔ خوش قسمت ہو۔ آج کل وہاں سب کی دعائیں نہیں سنیں جاتیں.....

'پھر میری کیوں سنی گئی۔'

'اس معاملے میں بھی خوش قسمت ہو۔'

'مرنے کے معاملے میں؟'

'ہاں.....' ملک الموت سنجیدہ تھا۔ ''ذرا باہر نکل کر دیکھو۔ تم نہیں جانتے، کتنے کتنے لوگ مرنا چاہتے ہیں۔ مگر موت سب کے نصیب میں کہاں——''

'کیونکہ گڈ بائی، خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے۔'
'ابھی تو میں.....ابھی کیوں.....؟'
اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی چالی بیالیس سال۔ یعنی ایسی عمر، جہاں پہنچ کر جوان رہنے کا احساس کچھ زیادہ ہی آپ کو پریشان کرنے لگتا ہے
'عمر سے کیا ہوتا ہے؟ ملک الموت ہنسا۔
'ہوتا کیوں نہیں ہے۔'
''نہیں ہوتا'' ملک الموت سنجیدہ تھا۔
'شکر کرو۔ پہلے آ گیا، موقع دے رہا ہوں— مرنے کا الہام سب کو نہیں ہوتا۔ وصیت کر جاؤ۔

ملک الموت اُس پر جھک گیا تھا—— 'بولو۔ کب آ جاؤں..... شکر کرو..... اس معاملے میں بھی خوش قسمت ہو۔ میں کبھی خبر کر کے نہیں آتا.....'

'پھر مجھ سے اتنی محبت کیوں.....'

'تم اتنی دردمندی سے، اللہ کے حضور میں گڑگڑا، گڑگڑا کے مجھے مانگ رہے تھے کہ مجھے ترس آ گیا۔ ذرا یاد کرو'

اُسے یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سارے منظر صاف تھے۔ زندگی میں سب کچھ بہت جلد کر لینے کا احساس—— ہر لمحہ جیسے ایک اونچی اڑان اُس کے حصّے میں تھی۔ کم کم سایہ، زیادہ زیادہ دھوپ—— وہ اس دھوپ میں ننگے ننگے پاؤں چلا تھا—— اور اسی طرح، ننگے ننگے پاؤں چلتے ہوئے 'وہ' ٹکرائی تھی۔ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں سے کھیلنے والی——

'تھوڑی سی برف ملے گی؟'

'کیوں نہیں۔'

پھر وہ برف کے ٹکڑوں سے کھیلنے والی اُس کے گھر آ گئی—— کبھی نہیں جانے کے لئے—— بچے ہو گئے۔ اب بچے برف میں کھیلتے تھے اور دروازے کے باہر برف کے ڈھیر لگنے لگے تھے۔ یکا یک زمین غائب ہو گئی۔ برف پگھلنے لگی۔ اُس کی سانس ڈوبنے لگی۔ ہوش میں آیا تو زندگی سے ایڈونچر غائب ہو چکے تھے۔ بدن بیماریوں کا گھر تھا—— اُسے یاد آیا، اُڑتے رہنے کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اُس نے کہیں بھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا—— اور اب چالیس بیالیس سال کا کمزور جسم آرام چاہتا تھا۔ ابدی سکون—— اور اس سکون کے لئے وہ گھنٹوں عبادت میں ڈوبا رہتا۔ روتا، گڑگڑاتا۔ گھر میں بوجھل سا ماحول تھا—— برف کے ٹکڑوں سے کھیلنے والی کو، اسکیٹنگ کے لئے باہر جانا ہوتا

تھا اور بچے، اُس کی بیماری سے گھبرا کر صاف لفظوں میں اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیتے تھے——

'چیخو مت۔ اس سے بہتر ہے کہ.....'

'بہتر ہے کہ.....'

'تم اچھی طرح جانتے ہو۔' بیوی ہنسی تھی——— باہر برف ہے اور بہت سی تتلیاں۔ تمہاری چیخ سے تتلیاں اُڑ جاتی ہیں۔'

کمرے کے گھنے اندھیرے میں پگھلنے والی ایک چھوٹی سی برف پر لکھ ہوتا تھا—— 'ابدی سکون' وہ اس سکون کے، نہ ختم ہونے والے نشہ میں ڈوبنا چاہتا تھا——

❖❖

'کچھ یاد آیا——' ملک الموت سنجیدہ تھا۔

'ہاں'

'تو چلو۔'

'کیوں۔ پریشانی میں ایسی باتیں تو سب کرتے ہیں۔ لیکن اب میں.....'

ملک الموت کو حیرانی تھی۔ 'تم انسان کبھی میری سمجھ میں نہیں آئے۔ خیر۔ اپنے اور اپنے گھر کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم..... پھر بھی۔'

'جینا اس سے مختلف ہے۔'

'مرنا سب سے مختلف ہے۔'

'زندگی خوبصورت ہے۔'

'موت اُس سے زیادہ دلکش۔'

'زندگی.....'

ملک الموت اس مکالمے سے پریشان تھا—— 'اچھا سنو۔ چلو۔ تمہارے اس مسئلے کا بھی حل نکالتے ہیں۔ ایسا کرو۔ کسی ایسے دو آدمی کا نام لو جو بے حد خوش رہتے ہوں۔'

'پھر کیا ہوگا؟'

'اگر مان لو ان کی خوشی، نقلی ہو، تو.....؟'

'مان ہی نہیں سکتا۔'

'مان لو——— مان لو اس کے باوجود وہ مرنا چاہتے ہوں۔'

'ایسا ہو ہی نہیں سکتا——' جواب دیتے ہوئے اُس کے سامنے ایسے دو آدمیوں کا چہرہ گھوم گیا تھا—— اور اُسے یقین تھا کہ اگر ملک الموت نے اس بوجھل گفتگو کو مزید آگے بڑھایا تو جیت اُسی کی ہوگی.....'

'مان لو.....'

'ٹھیک ہے..... پھر میں مرنے کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔'

> اسکرین پر اب کلوز میں جارج کا چہرہ ہے..... وہ رو رہا ہے ۔'میں سب جانتا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ یہ ناٹک کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں مجھ سے کوئی خوش نہیں—— نہ پارٹی۔ نہ عوام۔ نہ بیوی۔ نہ بچے——— کوئی بھی نہیں..... میں بھی نہیں——— میں نے یہ سب کچھ کیسے کیا، میں جانتا ہوں۔ مجھے اٹھالے۔ سکون دے دے۔ یا پھر میری زندگی سے راتیں چھین لے۔ تنہائی چھین لے۔ خاموشی کے لمحے چھین لے——'
>
> اسکرین پر ایک بار پھر اندھیرا تھا۔
>
> 'مائی گاڈ'——— لیکن اتنی دیر میں وہ اپنے آپ کو آگے کے مکالمے کے لئے تیار کر لیا تھا—— لیکن ایک آدمی کا سچ——'

'اب پہلے آدمی کا نام لو.....'

ملک الموت کو شاید بہت جلد بازی تھی۔ ایک لمحے کو اُس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ پھر اپنے باس جارج ولیم کا دھیان آ گیا۔ خیر سے منسٹر بھی تھا۔ ایک بے حد کامیاب آدمی۔ ایک خوشحال زندگی—— ایک بے حد چاہنے والی بیوی۔ بے حد پیار کرنے والے بچے۔ ہر جگہ ہر موقع پر اُس کے ساتھ—— ہنستے مسکراتے—— اور وہ اپنی ہر گفتگو میں اپنی کامیابی کا سہرا انہی کے سر باندھتا تھا——

اُس نے نام بتایا—— ملک الموت ہنسا—— لو دیکھو——— اُس کی ہتھیلیاں روشن تھیں——— اور اسکرین بن گئی تھیں۔ وہ سب کچھ صاف صاف دیکھ سکتا تھا——

صبح کا وقت۔ جارج ولیم بیوی بچوں کے ساتھ ہے۔ ہمیشہ قائم رہنے والی مسکراہٹ کے ساتھ۔ سیکوریٹی گارڈس ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک عمارت کی سنگ بنیاد کا منظر——— وہ فیتہ کاٹتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں——— منظر آگے بڑھتا ہے۔ سب کو نمسکار کرتا جارج ولیم اپنی بڑی سی گاڑی میں بیٹھتا ہے۔ گاڑی کوارٹر کی طرف روانہ ہوتی ہے۔'

اُس کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی—— 'دیکھا؟'

'اب آگے دیکھو——'

روشن اسکرین پر اب ڈائننگ ٹیبل ہے——— ہنستا مسکراتا خاندان ایک ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ ایک مشہور چینل کا پریس رپورٹر انٹرویو لے رہا ہے۔ کیمرہ آن ہے——— پریس رپورٹر مسکرا مسکرا کر سوال پوچھتا ہے۔ وہ جواب دے رہا ہے۔ 'بس یہی مختصر سی خوراک——— وہ بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ کھانا میری بیوی بناتی ہے۔ میرے لئے۔ یہ دلیہ۔ یہ فیرنی۔ وہ اپنے بچوں کی طرف دیکھتا ہے۔ بچے مسکرا رہے ہیں۔ جارج ولیم بتا رہا ہے..... یہ سب میری زندگی ہیں..... نہیں روح——— بس اور کیا چاہئے مجھے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہتھیار، میزائیل کچھ بھی نہیں۔ جنگ، ہماری نجی خوشحالی کو بھی تباہ کرتی ہے.....'

اُس نے تالیاں بجائیں—— 'دیکھا——'

'اب دیکھو' ملک الموت کے چہرے پر سنجیدگی تھی——

'اب کیا دیکھوں۔ اب اس سے زیادہ خوشی کیا ہوتی ہے——'

'آگے.....آگے دیکھو.....'

ہتھیلیوں پر اسکرین روشن تھا اور وہ یکا یک چونک گیا تھا ـــــ رات۔ رات کا وقت ـــــ دوسرے کمرے میں جارج ویلیم سو رہا ہے ـــــ بیوی کرسی پر بیٹھی ہے۔ ایک بڑی مونچھوں والا آدمی ٹہل رہا ہے ـــــ کتنے پیسے چاہئیں۔ رشتے مت دیکھئے..... رشتے تو جذباتی کر دیتے ہیں۔'

'پیسہ بہت ہے ہمارے پاس ـــــ جارج ویلیم کی بیوی کا چہرہ سپاٹ ہے ـــــ

'اور اگر آپ کو وہی کرسی آفر کی جائے جو جارج کے پاس ہے.....'

'آہ..... آپ سب جانتی ہیں۔ سب جانتی ہیں۔ آپ کو کرسی چاہئے تو ـــــ جارج کو مرنا ہوگا.....'

ہتھیلیاں اندھیرے میں ہیں۔ اسکرین پر بلیک آؤٹ۔

دیکھا ـــــ؟ ملک الموت ہنسا۔

'دیکھا۔'

'پھر ـــــ؟'

اُس کے لہجے میں کھوکھلا پن تھا۔ بچے بھی تو ہیں۔ جارج تو پوتے والا ہے ـــــ بیٹے کا بڑا لڑکا اب کالج میں ہے ـــــ'

'اچھا ـــــ لو وہ بھی دیکھو.....'

ہتھیلیوں پر اسکرین روشن ہو گیا ہے ـــــ جارج کا بیٹا پریشان ٹہل رہا ہے۔ بیٹے کی بیوی یعنی جارج کی بہو غصّے میں ہے ـــــ تمہیں کیا ملا۔ ہاں۔ کبھی تمہارے لئے ایم ایل اے یا ایم پی بننے کی بھی سفارش نہیں کی۔ کیوں ڈھور ہے ہو بڈھے کو ـــــ پیسہ مانگو اور باہر چلو۔'

ایک کمزور آواز۔ 'وہ راضی نہیں ہوں گے۔'

بہو بگڑتی ہے ـــــ 'تو مرو۔ نمائش کے گڈے، گڑیے بنا کر زندگی گزار دو۔ وہ جہاں جائے گا، ہمیں سجا کر لے جائے گا۔ دو چار ہمارے بارے میں ڈائیلاگ بولے گا۔ سنو ـــــ اُسے زہر دے دو ـــــ بہت سے دشمن ہیں اُس کے۔ پارٹی بھی یہی چاہتی ہے۔ تمہارے لئے کھلا آفر ہے ـــــ کچھ نہیں ہوگا بڈھے کی موت کا۔ سب خوشی منائیں گے۔ حکومت کچھ دن تک قتل کی تحقیقات کے لئے کمیشن بیٹھا دے گی۔ بس.....'

اُسے چکر آ رہے تھے۔ وہ زور سے چیخا ـــــ 'بس کرو۔'

'ہو گیا۔ اتنے میں ہی.....'

اُس کے پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا گئے

تھے ـــــ مائی گاڈ۔ یہ سب.....'

'یہی تمہاری دنیا کا سچ ہے۔'

'کیا جارج یہ جانتا ہے.....؟'

'لو، تم خود ہی دیکھ لو ـــــ'

ہتھیلیوں پر، اسکرین پھر روشن تھا ـــــ جارج ٹہل رہا ہے۔ ایک بے چین آتما۔ آنکھوں میں نیند نہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ لیٹ جاتا ہے ـــــ اور یہ کیا۔ وہ رو رہا ہے.....

'وہ کچھ کہہ رہا ہے.....'

ہاں تم بھی سنو.....'

اسکرین پر اب کلوز میں جارج کا چہرہ ہے..... وہ رو رہا ہے۔ 'میں سب جانتا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ یہ ناٹک کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں مجھ سے کوئی خوش نہیں ـــــ نہ پارٹی۔ نہ عوام۔ نہ بیوی۔ نہ بچے ـــــ کوئی بھی نہیں..... میں بھی نہیں ـــــ میں نے یہ سب کچھ کیسے کیا، میں جانتا ہوں۔ مجھے اٹھا لے۔ سکون دے دے۔ یا پھر میری زندگی سے راتیں چھین لے۔ تنہائی چھین لے۔ خاموشی کے لمحے چھین لے ـــــ'

اسکرین پر ایک بار پھر اندھیرا تھا۔

'مائی گاڈ' ـــــ لیکن اتنی دیر میں وہ اپنے آپ کو آگے کے مکالمے کے لئے تیار کر لیا تھا ـــــ لیکن ایک آدمی کا سچ ـــــ'

'اِسی لئے ـــــ میں نے تمہیں دو آپشن دئے ہیں۔ تمہاری زندگی میں تمہیں سب سے زیادہ خوشحال نظر آنے والے دو آدمی.....'

'کیا یہ کم نہیں ہے۔'

'نہیں۔ سب کی زندگی ایک سی ہے اور کوئی بھی تمہاری طرح جینا نہیں چاہتا۔ دو کافی ہیں۔ دو مثالوں میں، تم اپنی پوری دنیا پڑھ سکتے ہو۔ اچھا جلدی سے دوسرے کا نام لو.....'

'سوچنے تو دو.....'

اُس نے اپنے ذہن کو چاروں طرف دوڑایا ـــــ اپنے وسائل، اپنے رتبے کا سہارا لیا ـــــ پھر نیچے والی پائیدان پر آ گیا ـــــ ایک موٹر سائیکل مشکل سے خریدا گیا ایک چھوٹا سا گھر ـــــ صوفیہ اور اُس کا دوست.....'

'صمد.....' ملک الموت نے اُس کا خیال پڑھ لیا تھا۔

'ہاں۔'

'تم ان کی شادی میں گواہ تھے۔'

'ہاں۔ کیونکہ.....'

'بتاؤ مت۔ مجھے سب پتہ ہے۔ لو میرج کی تھی۔ گھر والے خلاف تھے۔ شادی کو 5 سال

ہو گئے۔ بچہ نہیں ہے۔'

'ہاں۔ مگر اس کے باوجود۔'

'تم جاتے رہتے ہو.....'

'کہاں؟'

'ارے ان کے گھر.....'

'ہاں۔'

'باہر بھی ملتے ہو——'

'ہاں۔ سنیما۔ ریستواں، کیفے۔' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ خوشحال زندگی کے لئے امیری کا تحفہ ضروری نہیں۔ ایک معمولی مڈل کلاس کا آدمی بھی.....'

'لکچر مت دو۔ اسکرین پر دیکھو۔'

ملک الموت نے ہتھیلیاں سامنے رکھ دی تھیں۔ اسکرین روشن تھا—— صبح کا وقت۔ ڈائننگ ٹیبل۔ دونوں پاس پاس بیٹھے ناشتہ کرتے ہیں۔ صوفیہ، دوست کو کھلا رہی ہے۔ دوست ہنس رہا ہے.....

'لگتا نہیں ہے کہ ہماری شادی کو.....'

'5 سال ہوئے ہیں۔' صوفیہ ہنستی ہے۔

دوست اُسے کھاتے ہوئے، گود میں کھینچتا ہے۔ صوفیہ کھلکھلاتی ہے۔ دوست اُس کے ہونٹوں کا بوسہ لیتا ہے۔'

'جھوٹا کر دیا۔'

'جھوٹا نہیں۔ پاک کر دیا 'پوتر'—— دوست ہنستا ہے.....

سین تیزی سے بدلتے ہیں—— دونوں باہر آتے ہیں۔ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہیں اور.....

'دیکھا'—— اُس نے اپنے ماتھے کا پسینہ پوچھا۔ جیسے موت اُس کی ہتھیلیوں سے دور نکل گئی ہو—— 'کتنے خوش تھے دونوں، دیکھا۔ زندگی یہ ہے۔'

'نہیں۔'

'تم اپنے وعدے سے ہٹ رہے ہو۔'

ملک الموت نے ہتھیلیاں آگے کر دی تھیں—— اسکرین ایک بار پھر روشن تھا—— دونوں پارک میں ہیں۔ ایک دوسرے کے بانہوں میں بانہیں ڈالے، دونوں کچھ محبت بھری باتیں بھی کر رہے ہیں۔

'ساؤنڈ، ڈیلیٹ کر دو۔'

'کیوں۔'

'میرے دوست ہیں۔'

'دوست کی محبت بھری باتیں نہیں سن سکتے۔'

'اچھا نہیں لگتا اور پھر—— اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے.....'

'اچھا چلو—— آواز مت سنو——'

محبت اور دیوانگی کے عالم میں صوفیہ اور دوست کو دیکھ کر اُس میں کچھ کچھ زندگی لوٹی تھی۔ دو ایک بار کھانسی آئی۔ آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا بھی چھایا لیکن پھر وہ ہتھیلیوں کے اسکرین پر لوٹ آیا.....

'دیکھا..... یہی سچ ہے.....'

'نہیں۔' ملک الموت سنجیدہ تھا۔ اب آگے دیکھو—— 'رات کا وقت۔ بستر۔ صوفیہ اور دوست قریب قریب۔ ہنسنے اور کھلکھلانے کی آوازیں۔ پھر ایک دوسرے سے لپٹنے اور بوسہ بازی کے مناظر—— وہ تیزی سے چیخا——

'بند کرو یار۔ یہ ایڈلٹ فلم زندگی میں بہت دیکھی ہے۔'

'دوست کی نہیں دیکھ سکتے۔'

'نا——'

'بھابھی ہے، اس لئے۔'

'ہاں۔ تقدس کا جذبہ بھی کوئی چیز ہے۔ ماں، بہن، بھابھی.....'

'چلو، تمہارے اندر اخلاقیات زندہ ہے۔ بڑی بات ہے.....'

'تو تم ہار گئے.....'

'ہار گئے——؟ ملک الموت ہنسا—— پاگل تو نہیں ہو گئے۔ ابھی تو تم نے صرف ان کی زندگی کا ایک رُخ دیکھا ہے—— بھوشن کو جانتے ہو۔'

'ہاں۔ صوفیہ کا منہ بولا بھائی۔'

'نہیں۔ بوائے فرینڈ۔'

'نہیں' وہ غصّے میں چیخا—— 'دوست بھی بھوشن کو جانتا ہے اور بُرا نہیں مانتا۔'

'اچھا—— تو دیکھو——'

ہتھیلیاں روشن تھیں۔ اسکرین پر پہلے پارک میں صوفیہ نظر آئی۔ کیمرہ پُل بیک ہوتے ہی، اُس کے پیچھے بھوشن نظر آیا۔ بھوشن صوفیہ کے چہرے پر جھکا ہوا تھا، کچھ کہہ رہا تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور ادھر۔ اُس کے اندر بیماریوں کے 'سیّال' دھوم دھڑاکا مچانے لگے تھے۔ نروس بریک ڈاؤن۔ ہائپر ٹینشن بڑھا ہوا شوگر۔ دماغ پر دھائیں دھائیں، پھیلتا اندھیرا بدن میں تھرتھراہٹ۔

'لیکن بھوشن تو.....'

وہ کہتے کہتے ٹھہر گیا۔ اس 'شریف' سے آدمی سے وہ کتنی کتنی بار ملا ہے۔ خود بھوشن اُس کی کتنی عزت کرتا ہے——

'دیکھا'—— ملک الموت سنجیدہ ہے——

اُس کے اندر طوفان آیا ہوا ہے—— بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔

'یہ سین کافی لمبا ہے۔ دیکھو گے—— ابھی جو کچھ دیکھا، وہ تو کچھ بھی نہیں ہے.....'

'نہیں.....'

اُس کی سانس ڈوب رہی تھی۔

ملک الموت نے اُسے جھنجھوڑا—— سنو۔ اب دوسرا منظر بھی دیکھ لو——

اس کی آنکھوں کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا——

'دوسرا منظر۔'

'ہاں۔'

'کیا منظر۔'

'اپنے دوست سے نہیں ملو گے۔ شریف اور مہذب آدمی۔ محبت کا مارا۔ بیچارا—— لو دیکھو لو——'

اسکرین روشن تھا اور یہ کیا۔۔۔ یہ تو جیسے کوئی ایڈلٹ منظر تھا۔ یہ دوست کا گھر تھا۔ بیڈروم..... لڑکی کو وہ پہنچا نتا نہیں تھا مگر یہ لڑکی صوفیہ نہیں تھی۔ دونوں کے بدن پر اس وقت برائے نام بھی لباس نہیں تھے۔۔۔

'صوفیہ ابھی نہیں آئے گی۔' دوست ہنس رہا تھا۔

'جانتی ہوں۔' لڑکی ہنس رہی تھی.....

'صوفیہ سے بور ہو گیا ہوں۔'

لڑکی کھکھلا رہی تھی۔۔۔ 'اور مجھ سے۔'

'تم آگ ہو اور اُسے تو برف کی پہاڑیوں سے لایا تھا.....'

کھکھلاہٹ۔ قہقہہ اور دوسرے میں گُم ہوتے ہوئے گوشت کی دو خوبصورت اُوبر کھابڑ پہاڑیاں۔ اور، اُسکی سانسیں گم ہو رہی تھیں۔ برف کی پہاڑیاں، وہ بھی تو 'اُسے' برف کی پہاڑیوں سے ہی لایا تھا۔ وہ بھی تو ایسا ہی کچھ، برف کی پہاڑیوں سے گھبرا کر۔۔۔ اُس کے بچے۔ اُس کا گھر۔ اُس کی بیوی۔۔۔ سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ سویّوں کے لچھے کی طرح ایک دوسرے میں اُلجھتی، ٹوٹتی ہوئی۔ پھر اُس نے زور سے چیخنے کی کوشش کی اور یہ کیا۔

گردن ڈھلک گئی تھی۔ سانسیں گم تھیں۔۔۔

اسکرین پر اندھیرا تھا۔ ملک الموت نے نبض دیکھی۔ ہلایا ڈلایا۔ پھر خود سے بڑبڑایا۔۔۔ کم بخت، کچھ لوگ اُس کی موجودگی کا فائدہ بھی نہیں اٹھاتے۔ وہ ہنس رہا تھا۔۔۔ لیکن اس ہنسی میں 'زندگی' سے زیادہ مکّاری شامل تھی۔۔۔ کیونکہ وہ انتہائی چالاکی سے دونوں کہانیوں کے آخری فریم کو کھا گیا تھا۔۔۔ اب، جبکہ اُس کی روح اُس کی مٹھیوں میں تھی، وہ اپنی آنکھوں کے اسکرین پر بچے ہوئے آخری فریم کو دیکھ کر لطف اٹھا سکتا تھا۔۔۔

اب آخری فریم سامنے تھا۔۔۔

اور اس فریم میں جارج ویلیم تھا۔ چہرہ جھکا ہوا۔ شرمسار۔۔۔ کیمرہ پین ہوتے ہی گھر کے دوسرے افراد نظر آجاتے ہیں۔ جارج ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا ہے۔

'آہ، موت..... موت کا احساس..... نہیں آپ سب مجھے ایسی آنکھوں سے مت دیکھو۔ یقیناً میں تم سب کا مجرم ہوں۔ یقیناً اپنے گھر، اپنے گھر کے لوگوں کا۔ مگر آہ۔۔۔ اس سے زیادہ اپنے ملک..... اپنی وفاداریوں اور ایمانداریوں کا..... اور اس سے بھی زیادہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب میری باتیں سنیں گے۔ آہ، صرف موت۔ موت جو ہتھیار اور میزائلس کی خرید و فروخت، جو تمام تر مکّاریوں سے زیادہ سچ ہے۔ نہیں، میں کنفیشن نہیں کرنا چاہتا۔ حق

بھی نہیں ہے مجھے۔ مگر آہ..... صرف یہ سوچ کر شرمسار ہو رہا ہوں کہ..... تم لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے۔ پیدا ہو کر بھی نہیں پیدا ہوئے۔ زندہ ہو کر بھی نہیں جئے.....'

جارج کچھ دیر کے لئے رُکا۔ اپنے پوتے کو قریب کھینچا۔۔۔ 'نہیں۔ میرے پیارے جمّی۔۔۔ ہم سب کو اپنی زندگی جینے کا حق ہے اور جینا بھی چاہئے۔۔۔ اس لئے تمام تر مکّاریوں کو..... نہیں۔۔۔ مجھے کہنے سے مت روکو..... میں الوداع کرنا چاہتا ہوں۔ ہاتھ ہلا کر الوداع۔۔۔ بس اتنی سی زندگی سکون میں گزر جائے گی نا۔۔۔

'بہت سے لوگ مارے گئے ہیں'۔۔۔ پوتا کہتے کہتے ٹھہرا۔ بہت سے لوگ مارے جا رہے ہیں'

'آہ کنفیشن۔ نہیں۔ مجھے ایسی آنکھوں سے مت دیکھو پوتے۔۔۔ مگر موت کا احساس..... تم سمجھ رہے ہو نا'۔

'ہاں' ابھی اتنا بہت ہے.....' بیٹا کہتے کہتے ٹھہرا۔ 'یہ احساس..... یعنی یہ میزائلوں کا احساس..... یعنی ابھی یہ مارے جانے والے لوگوں کا احساس.....'

بیوی کے چہرے پر شرمندگی تھی۔۔۔ کبھی کبھی ہم ایک نہ ختم ہونے والی شرمندگی میں جیتے ہیں۔ بہو آہستہ سے بولی۔۔۔ اور اسی شرمندگی میں مرجاتے ہیں۔ مگر۔۔۔ کیا اتنا کافی ہے؟

ملک الموت مکّاری سے مسکرایا، انسان ہونے کے لئے۔۔۔ اور جارج ویلیم جیسا آدمی۔۔۔ نہیں۔۔۔ انسان ہونے کی جون میں پیدا ہونے کے بعد اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ اب دوسری کہانی کا آخری بچا فریم بھی سامنے تھا۔۔۔ صوفیہ اور دوست دونوں ایک دوسرے کو ٹٹول رہے تھے۔۔۔ دوست کی آنکھوں میں نئے لمحوں کی اُڑان تھی۔۔۔ ہاں، تم سمجھ رہی ہو نا۔ ہاں تمہیں سمجھنا بھی چاہئے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے۔۔۔ دراصل..... اپنے اپنے وقت کے تقاضے کو سمجھنے میں، ہم سے کافی دیر ہو جاتی ہے۔۔۔ تم، کسی کے بھی ساتھ۔ تمہاری مرضی۔۔۔ جا سکتی ہو۔ اور میں..... اپنی قسم کی زندگی۔۔۔ نہیں، زیادہ خوش مت ہو۔ یہ سب نئی زندگی کے رنگ ہیں اور اس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے..... تم.....''

'انسان کمبخت'..... ملک الموت خود کو نڈھال محسوس کر رہا تھا۔ ممکن ہے باقی بچے فریم سے اُسے زندگی مل جاتی۔ ممکن ہے..... وہ بے حد تکان اور سانسوں کو ٹوٹتا محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے ژوں کے ساتھ گھوم کر غائب ہونا چاہا۔۔۔ مگر.....

□□□

غزل

کچھ تو ہمارا عکس بھی مبہم ہے دوستو
کچھ ہم پہ روشنی بھی ذرا کم ہے دوستو

لگتا ہے کوئی شام غریباں تھی کن فکاں
یہ ساری کائنات شب غم ہے دوستو

ماضی نہ حال کوئی نہیں ہے ابد تلک
یہ وقت ایک لمحۂ پیہم ہے دوستو

اس زخم دل کو روز نیا زخم دیجئے
یہ زخم جس کو زخم ہی مرہم ہے دوستو

سارے جہاں میں کوئی نظارہ نہیں جسے
یہ کہہ سکیں کہ آنکھ کا محرم ہے دوستو

جس سے گزر کے کچھ نہیں کھلتا کہاں ہیں ہم
اس راستے میں ایک عجم خم ہے دوستو

دل میں کبھی جو شہر بسایا تھا عشق نے
وہ شہر آج درہم و برہم ہے دوستو

امیر امام
نمبردار ہاؤس، نوریوں سرائے، سنبھل
موبائل: 8755593144

غزل

چنچل بیری ضدی دھوپ
گھر میں شور مچاتی دھوپ

سورج کوئی قتل ہوا ہے
صحرا میں ہے سہمی دھوپ

رات کے ان صحراؤں میں
میرے ساتھ میں کھیلی دھوپ

بیٹھ گئی دالانوں میں
دیواروں سے دبکی دھوپ

ایک ندی پر بیٹھ گئے ہیں
پیاسا سورج پیاسی دھوپ

نوک سناں پہ دیکھ کے سورج
شام سے مل کر روئی دھوپ

نو مید امکانِ ظفرؔ ہے
روز کی آتی جاتی دھوپ

ظفر تقی
چھوٹی مسجد، جمال پور، علی گڑھ،
موبائل: 7905105408

نسخہ

ڈاکٹر مسرور صغریٰ
وشو بھارتی، شانتی نکیتن، بول پور، مغربی بنگال
موبائل: 9643957254

ڈاکٹر صاحب آخر آپ کیوں نہیں سمجھتے میں نے کہا نہ میں جینا نہیں چاہتی۔ آپ کو خدا کا واسطہ ڈاکٹر صاحب مجھے مرجانے دیجئے آخر کیوں بچانا چاہتے ہیں آپ، شکستہ جسم دریدہ جبین ناز کے صدائے نالۂ بے اختیار سے وارڈ کا سکوت اس طرح درہم برہم تھا گویا وہ بھی اس کی تنہائیوں کا جشن منا رہا ہو ناز کے زخم آنکھوں سے لہو کی صورت ٹپک رہے تھے افسوس کہ ہمیشہ خشک مشکیزہ ہی اس کے حلقوم کی نگرانی میں رہا اس نے خطۂ پیاس کو دریا سے ہمیشہ الگ ہی رکھا تھا وہ درحقیقت معتکف دشت اذیت تو نہیں تھی مگر اس کے باوجود اس کے پیروں سے مسافت غم کے بھنور ہنوز نہیں گئے تھے شاید جس درد سے وہ وہ دوچار تھی اسکی شدت نمو خیز بہت تھی اس کی آنکھوں میں زخموں کے گلاب مہک رہے تھے اور وہ اسی حالت میں ڈاکٹر سے مسلسل التجا کئے جارہی تھی کہ وہ جینا نہیں چاہتی مگر ڈاکٹر تو تعقل پسند ہوتے ہیں ان کا کام تو زندگی دینا ہوتا ہے لینا نہیں۔

وہ ناز کی آشفتہ مزاجی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کوششوں میں ہمہ تن مصروف تھے اور ساتھ ہی محو حیرت بھی کہ جس عمر میں لڑکیاں جینے کی خواہش کرتی ہیں۔ آرزوئیں، تمنائیں اور امنگیں شباب پر ہوتی ہیں۔ وہ مرنا چاہتی ہے جبکہ اس عمر میں تو ایک خوشگوار احساس انہیں اپنے حصار، آغوش میں لئے رہتا ہے وہ یوں محسوس کرتی ہیں گویا زرد پتوں کی چمکتی ہوئی پیشانی پر بادصبا کسی کا نام لکھ رہی ہو جیسے سنسان جزیروں میں کہیں کوئی تارہ جھلملا رہا ہو، دھوپ کے زرد جزیروں میں قوت نمو کروٹیں لے رہی ہو اور موسم بہاراں میں وہ اپنا نام خود اپنی پلکوں سے لکھتی ہیں گویا انہوں نے انہی کی نرگسی آنکھوں پہ فریفتہ ہو کر اپنے وجود کو صحن گلشن میں اتارا ہے، بارش کی ہر بوند نفوس تمنا میں ایک تلاطم برپا کر دیتی ہے، جس کے ریشمی جذبات دشت بلا خیز میں پا برہنہ ٹہلنے لگتے ہیں، فضاؤں کی دلربائی پہ مچل مچل جاتی ہیں، سمندر کی طغیانی میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری کائنات اس کے ساتھ رقصاں و درخشاں ہے اور ہر شئے یہ گنگنا رہی ہے مجھے سکوت نہیں گوارہ مجھے جولانی چاہئے، ایسی جولانیت جس کی کوئی منزل نہیں اگر ہے تو نا قابل گرفت، ایسی بلا کی عمر میں وہ مرنا چاہتی ہے تو آخر کیوں؟

وہ ناز کی آشفتہ مزاجی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی کوششوں میں ہمہ تن مصروف تھے اور ساتھ ہی محو حیرت بھی کہ جس عمر میں لڑکیاں جینے کی خواہش کرتی ہیں۔ آرزوئیں، تمنائیں اور امنگیں شباب پر ہوتی ہیں۔ وہ مرنا چاہتی ہے جبکہ اس عمر میں تو ایک خوشگوار احساس انہیں اپنے حصار، آغوش میں لئے رہتا ہے وہ یوں محسوس کرتی ہیں گویا زرد پتوں کی چمکتی ہوئی پیشانی پر بادصبا کسی کا نام لکھ رہی ہو جیسے سنسان جزیروں میں کہیں کوئی تارہ جھلملا رہا ہو، دھوپ کے زرد جزیروں میں قوت نمو کروٹیں لے رہی ہو اور موسم بہاراں میں وہ اپنا نام خود اپنی پلکوں سے لکھتی ہیں۔ گویا انہوں نے انہی کی نرگسی آنکھوں پہ فریفتہ ہو کر اپنے وجود کو صحن گلشن میں اتارا ہے، بارش کی ہر بوند نفوس تمنا میں ایک تلاطم برپا کر دیتی ہے، جس کے ریشمی جذبات دشت بلا خیز میں پا برہنہ ٹہلنے لگتے ہیں، فضاؤں کی دلربائی پہ مچل مچل جاتی ہیں، سمندر کی طغیانی میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری کائنات اس کے ساتھ رقصاں و درخشاں ہے اور ہر شئے یہ گنگنا رہی ہے۔

حالانکہ اسکے چہرے پر بھی علالت و نقاہت کے چنداں کوئی اثرات نمایاں نہ تھے اسے کوئی ظاہری تکلیف نہ تھی سوائے اس کے کہ وہ کئی سالوں سے نیند سے محروم ہو چکی تھی جب ساری دنیا محو خواب ہوتی وہ جاگا کرتی تھی ہاں ایسا ہی تو تھا اس نے کئی بار عون سے کہا تھا:

عون! بخدا مجھے رات بھر نیند نہیں آتی؟ تم کیوں نہیں سمجھتے ہو؟ عون! تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ عون! تم بھی نہ بس کہہ دیتے ہو سو جاؤ، کیسے سو جاؤں، جب نیند ہی نہیں آتی!

کتنا چاہا تھا اس نے عون کو جیسے باغباں اپنے چمن پر بہار کو، جیسے سورج کی کرن سیپ کے دل میں اتر جایا کرتی ہے، جیسے کوئی آبلہ پا بارش کی دعا مانگا کرتا ہے جیسے بستر نزع پہ موجود کوئی بیمار اپنی زیست نو کے لئے بیتاب ہوا کرتا ہے، جیسے غنچے کھلے موسم سے حنا مانگا کرتے ہیں یا اس سے بھی کہیں زیادہ عون سے محبت

کر کے اس نے بھی اپنا نام بھی محبت کی محضر شہادت میں تحریر کروالیا تھا۔

عون کے غبار پا کی کج کلاہی میں اس نے اپنے غرور نخوت و انا کی تمام کمانیں توڑ دی تھیں ٹوٹ کے چاہا تھا اس نے عون کو وہ بھی انجام کی پرواہ کئے بغیر عون سے محبت کی سرشاری میں وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک ایسے ستم رسیدہ کم نصیب غنچے کی مانند ہے جسے اس کے گلشن حیات میں موسم بہار کی گلابی فضا میں کھلنے سے پہلے ہی نذر خزاں کر دیا گیا۔

وہ ایک ایسے صحرا کی مانند ہے جہاں کوئی مسافر بھٹکتا ہوا آ تو جاتا ہے مگر وہاں کے ویران اور قحط زدہ آب و ہوا سے دل برداشتہ شدت تشنہ لبی سے مجبور اپنی زیست کی بقا کی دہائی دیتا ہوا چارہ زیست تلاش کرنے کی فکر میں راہ فرار اختیار کر لینے پر مجبور نظر آتا ہے ،رنج وغم حزن و ملال درد و تکلیف، اشک و اضطرابی ،گھٹن و وحشت کی دہکتی ہوئی تپش نے اس کے مکمل وجود کو ایسے انگاروں میں تبدیل کر دیا ہے کہ بھولے سے بھی کوئی چھولے تو جل جائے اور ایسے آبلے اس کے وجود میں پڑ جائیں جسکی ٹیس تا حیات باقی رہے، جذبات واحساسات اس نوکیلے خاردار شجر کی شکل اختیار کر چکے ہیں کہ کسی کا بھولے سے بھی نزدیک سے گزر ہوجائے تو زخمی زخمی ہوجائے اور ایسے زخم جو کبھی مندمل نہ ہو پائیں، ارمان وخواہشات اس گوشہ تشنگی میں منہ چھپا چکے ہیں کہ شدت عطش سے نیلے ان کے وجود کی سیرابی کی اب کوئی سبیل نہیں ،اس کے نحس اثرات کے زیر سایہ یہ تو ممکن ہے کہ قحط محبت سے بیقرار اس کی روح کو آب نظر تو آجائے مگر یہ بھی طے ہے کہ وہ فقط وادیٔ صحرا کے سراب سے مشابہ ہو مگر افسوس کے اس کے نزدیک حرف قصاص کی کوئی صورت نہ تھی۔

والدین نے انتہائی کمسنی میں ناز کی شادی اسی کے پھوپھی زاد سے کر دی تھی جسے ناز قطعی پسند نہیں کرتی تھی کیوں کہ اس کے قلب میں علم کی شمع

> یوں زندگی گزر رہی تھی ناز کی، جو اس سے گزاری نہیں جا رہی تھی غم اور درد کا لامتناہی و دشوار گزار سفر اس نے کیوں کر طے کیا یہ تو اس کے حوصلے اور سرخ آنکھیں ہی جانیں مگر ہاں، اس نے سفر طے کر لیا تھا اور اسی دوران اس کی زندگی میں عون آیا تھا جس کی محبت میں ناز جاں نذر گزاری پہ بھی آمادہ تھی مگر جب وہ عون کے نزدیک اپنے ماضی کے اوراق فرداً فرداً الٹنے لگی تو عون کی دنیا گویا اس کی تیزابیت سے جھلس کر رہ گئی اس نے بڑے سلیقے سے سماج و معاشرے کی دہائی دیتے ہوئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔
>
> عون کی بے رخی نے ناز کی سانسوں کی شیرازہ بندی کو منتشر کر دیا تھا اور اس کا حال اس احوال کو پہنچا کہ خاک نشینی اس کی محرم جاں بن گئی۔ اس نے وحشت شب کی عزاداری میں سکون تلاش کرنا شروع کر دیا اسی دوران اسے داخل اسپتال کیا گیا جہاں روز بروز اس کی حالت بگڑتی گئی اور وہ ایسے ہی حالات میں بار بار ڈاکٹر سے التجا کر رہی تھی کہ ڈاکٹر مجھے جینا نہیں ہے مجھے مر جانے دیجئے۔ ڈاکٹر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولا آخر کیوں تم مرنا چاہتی ہو؟ آخر کیوں؟ خدا کی دی ہوئی اس انمول نعمت کو ٹھکرانا چاہتی ہو؟ تم کیا سمجھتی ہو؟ کائنات میں تمام لوگ خوش و خرم ہیں؟

کی ہلکی سی بھی ضو موجود نہ تھی وہ بے شعور تھا مگر گھر والوں نے نا آگہی کے سبب ناز کا نکاح شجی سے کر دیا تھا مگر ناپسندیدگی اس وقت اور بڑھی جب ناز نے شب عروسی کی نزدیکی سے شجی کی لاشعوری کا مکمل تجزیہ کر لیا۔

نتیجتاً شادی کے دوسرے ہی دن اس نے شجی کو اپنا شوہر تسلیم کرنے سے انکار کیا شجی کی ناپسندیدگی تو اپنی جگہ تھی ہی مگر ناز کے سسرال والے اسی قبیل کے لوگ تھے جنہیں اگر موقع ملے تو زر کفن سے قبائے زر تیار کر لیں اور جہیز کے لئے بہوؤں کو زندہ جلا دینے والوں میں سے تھے۔

ناز بھی ایسے ہی حادثے سے حتماً دوچار ہوجاتی اور اسکا حال بھی وہی ہوتا جو ازل سے آج تک بہوؤں کا ہوتا آرہا ہے اگر وہ ضد کر کے اپنی خالہ جان کے ساتھ دوسرے ہی دن اپنے مائیکے واپس نہ آگئی ہوتی۔

بیشک ناز کے سینے میں کسی آسمانی صحائف کے اسرار تو پوشیدہ نہ تھے مگر وہ جانتی تھی کہ والدین رشتوں کے تعین کے وقت کم فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں اور تعجیل کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جب ان کی بچیوں کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ کسی نے جادو ٹونا کر دیا غیرہ وغیرہ۔قسمت پھوٹ گئی کچھ نہیں ہوتا والدین سے لاشعوری ہو جاتی ہے نا آگہی ہوجاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنی بچیوں کی زندگیوں کو خود برباد کرتے ہیں۔

ناز کے اس حادثے سے دوچار ہونے کے فوراً بعد اس کے والد نے داعئ اجل کو لبیک کہا ناز کی ویران زندگی کی ویرانی کو مزید جلا بخشنے میں شاید کوئی کسر باقی رہ گئی تھی اسی لئے تو عقیل اس کی زندگی میں ایک ایسے زہریلے ہوا کے جھونکے کی مانند آیا تھا جو چند ہی لمحوں میں ناز کی فضائے زیست میں موجود تازگی اور رمق کی ہلکی سی لہر کو بھی فنا کر کے اسے نیم جاں کر گیا تھا۔

عقیل نے اپنی باتوں سے اپنے خیالات سے ناز کی والدہ کو اس طرح اپنا گرویدہ بنا لیا تھا کہ

ناز کی والدہ نے ناز کے نہ چاہتے ہوئے بھی ناز کی شادی عقیل سے طے کر دی اور ناز کی شہ رگ انا پر خود اس کی انا کا خنجر دوبارہ چل گیا مگر عقد کی پہلی رات ہی عقیل نے اپنی اصل صورت دکھا دی اور تمام شب وہ موبائل پر ایک غیر لڑکی سے محو گفتگو رہا۔

دوسرے دن جب وہ اپنے مائیکے آئی تو وہاں بھی اس نے اپنی ہمراز سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ ناز نے جب اس حرکت کی مزاحمت کی تو عقیل نے انتہائی بے رحمی سے اسے چارپائی سے ڈھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے جتنے ظلم اس پر کر سکتا تھا کئے اور جب دروازہ کھولا گیا تو ناز اپنے کمرے میں بیہوش پائی گئی۔

ظلم کی انتہا سے ظالم کے دست و پا ابھی شل تو نہیں ہوئے تھے مگر افسوس کہ مظلوم کا خشک گلو ابھی زندہ تھا ناز کے گھر میں گویا ایک قیامت سی آ گئی تھی شادی کے تیسرے ہی دن وہ اسپتال میں تھی۔

جب ناز کی والدہ نے عقیل سے اس کے اس وحشیانہ اقدام کی وجہ پوچھی تو اس نے خرد کی حیلہ سازیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تکذیب صداقت سے کام لیا اور کہنے لگا کہ ناز بہت شکی مزاج عورت ہے اس کے ساتھ میرا گزارا کرنا ناممکن نہیں۔

دراصل عقیل کی تہذیب تربیت میں ہی نقص تھا۔ وہ مکتب مکر و شر اور ظلم و استبداد سے گویا پہلا اور آخری فارغ التحصیل طالب علم تھا اور ایسے لوگوں سے علیحدگی اختیار کر لینے میں ہی عافیت ہے۔ ان کی تخلیق ہی اس لئے ہوتی ہے کہ انہیں کوچۂ گرد و ملامت سے ہزار مرتبہ گزارا جائے اور پھر اسی سلسلے کو باقی رکھا جائے۔

افسوس صد افسوس کہ اس حادثے کے بعد بھی فلک اپنی جگہ برقرار تھا اور نظام حیات رواں دواں۔ شاید یہی زندگی ہے۔ ناز کو دونوں مرتبہ مہر کی رقم سے محروم رکھا گیا کیوں کہ شریعت میں ہے کہ لڑکی خود سے خلع لے لے تو شوہر پر مہر کی ادائیگی واجب نہیں۔

اب اس خلع کا سبب جو بھی ہو اس سے کوئی علاقہ نہیں مگر کیا واقعی اپنے مفاد کے تحت شریعت کی دہائی دینے والے لوگ شریعت کے ہر احکام کو یوں ہی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں؟

نہیں! ہرگز نہیں۔

کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو آج ناز کی زندگی اس حادثے سے دو چار قطعاً نہ ہوتی مگر ناز کسے مورد الزام ٹھہرائے اپنی تقدیر کو جو انتہائی زور آور ہے یا اپنی

والدہ کو جو بہت کمزور و ناتواں ہیں۔

یوں زندگی گزر رہی تھی ناز کی، جو اس سے گزاری نہیں جا رہی تھی غم اور درد کا لامتناہی و دشوار گزار سفر اس نے کیوں کر طے کیا یہ تو اس کے حوصلے اور سرخ آنکھیں ہی جانیں۔

مگر ہاں، اس نے سفر طے کر لیا تھا اور اسی دوران اس کی زندگی میں عون آیا تھا جس کی محبت میں ناز جاں نذر گزاری پہ بھی آمادہ تھی۔

جب وہ عون کے نزدیک اپنے ماضی کے اوراق فرداً فرداً الٹنے لگی تو عون کی دنیا گویا اس کی تیزابیت سے جھلس کر رہ گئی اس نے بڑے سلیقے سے سماج و معاشرے کی دہائی دیتے ہوئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

عون کی بے رخی نے ناز کی سانسوں کی شیراہ بندی کو منتشر کر دیا تھا اور اس کا حال اس احوال کو پہنچا کہ خاک نشینی اس کی محرم جاں بن گئی۔

اس نے وحشت شب کی عزاداری میں سکون تلاش کرنا شروع کر دیا اسی دوران اسے داخل اسپتال کیا گیا جہاں روز بروز اس کی حالت بگڑتی گئی۔

وہ ایسے ہی حالات میں بار بار ڈاکٹر سے التجا کر رہی تھی کہ ڈاکٹر مجھے جینا نہیں ہے مجھے مر جانے دیجئے۔ ڈاکٹر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

آخر کیوں تم مرنا چاہتی ہو؟

آخر کیوں؟ خدا کی دی ہوئی اس انمول نعمت کو ٹھکرانا چاہتی ہو؟

تم کیا سمجھتی ہو؟

کائنات میں تمام لوگ خوش و خرم ہیں؟

کسی کو کوئی غم لاحق نہیں!

مجھے دیکھو! تمہیں معلوم ہے، میں کس قدر غم و درد سے گزر چکا ہوں میں؟

میرا کوئی نہیں اس دنیا میں پھر بھی میں زندہ ہوں، کس کے لئے، جانتی ہو تم؟ لوگوں کے لئے، تم جیسے مریضوں کیلئے، انہیں نئی زندگی دینے کے لئے اور یہ کہتے کہتے ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ دیکھ کر ناز کا انتشار اس کے بیڈ کے عقبی کھڑکی سے ڈوبتے ہوئے سورج کی آنے والی شعاعوں کے ذرات میں دھیرے دھیرے تحلیل ہونے لگا۔ گویا اس نے اپنی ذہنی حالت پر مکمل گرفت حاصل کر لی ہو۔

❑❑❑

غزل

سونا چاہت ہیرا من شہزادے کا
عشق سراپا پیراہن شہزادے کا

اس سے بڑھ کر کیا دولت کی چاہ کروں
میرے پاس ہے سندر من شہزادے کا

ان کو آنسو مت کہنا اچھے لوگو
آنکھ میں اترا ہے ساون شہزادے کا

ایک دعا ہی لب پر اٹکی رہتی ہے
کبھی نہ چھوٹے اب دامن شہزادے کا

میں بھی ہوں انمول نگاہوں میں اس کی
اور بھلا کیا ہوگا دھن شہزادے کا

جب بولے تو صحرا میں بھی پھول کھلیں
شیریں لب، سیراب سخن شہزادے کا

ہر پل ہر دم رستہ دیکھا کرتی ہوں
میں پگلی، دیوانی بن شہزادے کا

کیسے روٹھتا اور جھگڑتا رہتا ہے
دیکھے کوئی پاگل پن شہزادے کا

مجھ میں رباب ہے یوں چاہت شہزادے کی
روح سے باندھ لیا بندھن شہزادے کا

فوزیہ رباب
ماپوسا، گووا
موبائل: 9175521025

غزل

ظلم ڈھائے گئے اس طرح سے دیوانے پر
زخم خود گریہ کناں ہیں مرے افسانے پر

مجھ کو یکسر ہی الگ رہنا پڑا ہے تم سے
ایسا ہی ہوتا ہے کیا عشق کے مر جانے پر

روح کی چاک پہ پہلے اسے گردش دی ہے
درد لکھا گیا پھر جسم کے پیمانے پر

پہلے یکلخت چلے آتے تھے ملنے کے لئے
اب توجہ بھی نہیں ہے مرے چلّانے پر

سوزشِ غم کا چراغوں کو کہاں اندازہ
رات چیخ اٹھتی ہے جلتے ہوئے پروانے پر

خود مرا دل بھی ہوا جاتا ہے اب میرا حریف
اسی کافر کا ہوا جاتا ہے سمجھانے پر

دردِ فرقت ہی مری موت کا ساماں ہے قمرؔ
دل کسی طور بہلتا ہی نہیں بہلانے پر

قمر عباس قمرؔ
نیم تل، بڑا گاؤں گھوسی، مئو
موبائل: 9044838769

ایک بے عنوان افسانہ

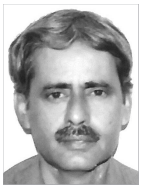

ہلال نقوی
GA-35/390، رستم نگر، لکھنؤ
موبائل: 9839274641

وہ فطری طور پر ایک حسن پرست انسان تھا۔ مجھے جہاں تک یاد ہے وہ سات یا آٹھ سال کی عمر سے ہی حسین چہروں کی جانب ایک خاص کھینچاؤ محسوس کرنے لگا تھا۔ خود بھی ایک پرکشش چہرے مہرے کا مالک تھا۔ عمر جیسے جیسے سفر طے کررہی تھی اس کے امور حسن پرستی کا جذبہ توانائی اختیار کرتے جارہے تھے۔ وہ اسکول کی منزل سے نکل کر کالج میں داخل ہوا۔ پڑھائی لکھائی میں برائے نام تھا لیکن بلا کا ذہین تھا۔ خواب بلند تھے۔ پہروں عجیب تانے بانے بنا کرتا تھا۔ مزاج کا اچھا اور ملنسار تھا لیکن بہ وقت ضرورت ہی ہجوم میں شامل ہوتا تھا۔ کالج میں اس کی منفرد خوبیوں نے لڑکیوں کا دھیان اس کی طرف کھینچا۔ اس کی تنہائی خاموش مزاجی، خوش لباسی، لڑکیوں کی توجہ کا سبب بنے۔ مالی حالات بھی اطمینان بخش تھے۔ والد بینک میں تھے۔ خاطر خواہ تنخواہ تھی۔ ماں باپ کا اکیلا بیٹا تھا۔ ظاہر ہے حالات اچھے تھے، اس کی دوستی جمی نام کی حسین لڑکی سے ہوگئی۔ گورا رنگ خوبصورت ناک نقشہ لمبا قد، لمبے بال والی حسین لڑکی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں کی دوستی سفر طے کرنے لگی۔ وہ ایک برساتی شام تھی۔ بارش کی پھواریں تھم چکی تھیں۔ ہوا ہلکی اور سرد تھی۔ وہ اور جمی قصبے کی مارکٹ میں ایک گھڑی کے شوروم میں موجود تھے۔ اس نے ایک قیمتی گھڑی پسند کی اور اس وقت جمی کی کلائی میں پہنادی۔ جمی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ ''شکریہ۔ لیکن یہ تو کافی مہنگی گھڑی ہے۔''

وہ فلمی انداز میں مسکرایا اور بولا: ''کیا تمہاری خوبصورت آنکھوں سے بھی زیادہ مہنگی ہے؟''

جمی نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔ سیلز گرل مسکرا رہی تھی۔ وہ خود بھی جھینپ گیا۔ پھر وہ ایک معتبر اور مناسب ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ آج وہ کچھ مغلئی کھانا کھانا چاہتا تھا۔ پھر کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانے

وہ ایک برساتی شام تھی۔ بارش کی پھواریں تھم چکی تھیں۔ ہوا ہلکی اور سرد تھی۔ وہ اور جمی قصبے کی مارکٹ میں ایک گھڑی کے شوروم میں موجود تھے۔ اس نے ایک قیمتی گھڑی پسند کی اور اس وقت جمی کی کلائی میں پہنادی۔ جمی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ ''شکریہ۔ لیکن یہ تو کافی مہنگی گھڑی ہے۔''

وہ فلمی انداز میں مسکرایا اور بولا:

''کیا تمہاری خوبصورت آنکھوں سے بھی زیادہ مہنگی ہے؟''

جمی نے شرما کے نظریں جھکا لیں۔ سیلز گرل مسکرا رہی تھی۔ وہ خود بھی جھینپ گیا۔ پھر وہ ایک معتبر اور مناسب ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ آج وہ کچھ مغلئی کھانا کھانا چاہتا تھا۔

کے دوران جمی سے اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ ''یہ بتاؤ دنیا میں سب سے مطمئن کون ہے؟''

جمی نے کچھ لمحے تفکر سے کام لیا پھر اپنے حسین پتلے لبوں کو زحمت دی۔ ''وہ کہ جسکی آرزوئیں مختصر ہوں۔''

ایک پل وہ اس جواب پر حیران رہ گیا۔ پھر بولا: ''ٹھیک ہے۔ لیکن! ایک جواب اور بھی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟'' جمی نے پوچھا۔ کچھ پل کی خاموشی توڑ کر اسکی آواز گونجی: ''دنیا میں وہ انسان سب سے مطمئن ہے کہ جس کے پاس حسن و جمال ہے۔''

جمی حیران ہو کر رہ گئی؛ ''یہ کیسی منطق ہے؟'' اس نے پوچھا: وہ اس کی حیرانی پر مسکرادیا۔ بولا: ''یہ منطق ہی ہے۔ دراصل یہ دنیا تین خوبیوں سے رعب میں آتی ہے۔ طاقت، دولت، حسن و جمال۔ ان میں سب سے بااثر خوبی حسن انسانی ہے۔ جو ایک طاقت ور انسان کو بھی اپنا غلام کرلیتی ہے اور مال دنیا اس کے قدموں میں خود چل کر آتا ہے۔ تم تاریخ انسانی کا جائزہ لو۔ ماضی کی داستانوں کا مطالعہ کرو۔ بادشاہوں، طاقت ور انسانوں کی تاریخ کے اوراق الٹو۔ میری بات کی قائل ہوجاؤ گی۔ پھر بات کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔ دونوں کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ ہوٹل سے ایک شاندار ڈنر کے بعد اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ وقت آگے اور آگے چلتا گیا۔ دونوں کی ملاقاتیں تیز اور تیز ہوتی گئیں۔ دونوں کی دوستی اب اس موڑ پر تھی کہ جہاں زندگی کا ایک اہم ترین فیصلہ کیا جاتا ہے۔ جمی کا شباب اب اس کے خاندان میں موضوع گفتگو تھا۔ اچھے رشتہ آنے لگے۔ جمی تعلیم کے نام پر B.Com مکمل کرچکی تھی۔ سی۔ اے کی تیاریوں میں مشغول تھی۔ ماں اور باپ فکرمند تھے کہ اس قدر رشتوں کے ہجوم میں مناسب رشتہ کسے قرار دیا جائے۔ کوشش جاری تھی۔

ادھر وہ بھی بی کام کی ڈگری حاصل کرچکا تھا۔ لیکن اس کی دلچسپی نوکری میں نہ ہو کر کاروبار میں تھی۔ ماں باپ

راضی تھے کسی اچھے کاروبار کی تلاش تھی۔ جمی سے اس کی ملاقاتیں جاری تھیں لیکن جیسے یہ ملاقاتیں اب دونوں سے کچھ تقاضہ کررہی تھیں۔ لیکن شاید دونوں اس تقاضے کی آوازوں سے غافل تھے۔ بازار ہوتے، تحفے ہوتے، پھر ہوٹل ہوتے اور پھر گھروں کے جانے پہچانے رستے ہوتے۔ یہ سلسلہ جاری تھا۔ ایک حسین شام دونوں ایک کافی شاپ میں بیٹھے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جمی بول رہی تھی اور وہ سن رہا تھا۔ اچانک وہ بولا: ''تم میری فکر اور نظریات سے کہاں تک متفق ہو؟'' جمی نے مسکرا کر جواب دیا۔ کافی حد تک۔ لیکن تم حرف آخر نہیں ہو۔'' یہ جواب اسے قطعی اچھا نہ لگا۔ کچھ لمحے اس نے خاموش رہ کر گزارے پھر بولا: ''کچھ بھی کہو لیکن تم خوب جانتی ہو کہ میں ایک خاص انسان ہوں۔ شاید میرے خیالات تمہیں منطقی نظر آتے ہیں لیکن ہر لحاظ سے درست ہیں۔ زندگی ایک خاص نعمت ہے جسے عام لوگوں نے عام سمجھ لیا ہے۔'' وہ تھوڑا رکا اور پھر بولا: ''اچھا یہ بتاؤ شادی وغیرہ کب کروگی اور کیسے انسان کو ترجیح دوگی؟'' جمی مسکرائی اور بولی ''اس وقت اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔'' پھر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔

وقت نے کروٹ بدلی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی برس گزر گئے۔ وہ ایک مارکیٹنگ بزنس میں مصروف ہوگیا۔ آفس کھول لیا۔ ایک چھوٹا سا اسٹاف رکھا۔ اب زیادہ تر وہ باہر کے دورے کرنے لگا۔ چونکہ پڑھا لکھا تھا۔ کاروباری صلاحیت تھی۔ محنتی تھا لگن تھی اس لیے کاروبار چل نکلا۔ اب اس کا شمار شہر کے اچھے کاروباریوں میں ہونے لگا۔ وقت کی قلت نے جمی سے ملاقاتیں ختم کروادی تھیں۔ ماں باپ اس کے لیے اچھا رشتہ تلاش کررہے تھے۔ وہ بھی راضی تھا۔ ادھر جمی بھی C.A کا کورس کامیابی کے ساتھ مکمل کرچکی تھی۔ نوکری کی ضرورت تو نہ تھی لیکن نوکری تلاش کررہی تھی۔ اس کے ماں باپ نے ایک خوبصورت حسین وجمیل لڑکا ڈھونڈا اور جمی کی شادی ہوگئی۔ لڑکا بے پناہ خوبصورت تھا۔ مال دار گھرانے کا تھا۔ شہر میں عزت تھی۔ دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ جمی بھی بہت خوش تھی۔ دن آرام سے گزرنے لگے اور کب ایک برس گزر گیا خبر نہ ہوئی۔

ایک دن جمی کے شوہر نے اسے خبر دی کہ آج رات ایک شادی میں شرکت کرنا ہے۔ شہر کی ایک اہم شادی ہے۔ اور پانچ ستارہ ہوٹل ''لیما'' میں ہے۔ جمی تیاری میں مشغول ہوگئی۔ سورج کے غروب ہوتے ہی جمی اپنے شوہر کے ساتھ ''لیما'' کی جانب روانہ ہوگئی۔ ایک عرصے کے بعد وہ کسی شادی میں شریک ہورہی تھی۔ جمی کی کار شہر کی مختلف شاہراہوں سے گزر کر ایک عالی شان عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئی۔ کافی عریض وکشادہ لان تھا۔ شہر کے امیروں کی امپورٹیڈ گاڑیاں سلیقے سے کھڑی تھیں۔ لان میں چہل پہل تھی۔ روشنیوں کی برسات ہورہی تھی۔ قدم قدم پر سیکورٹی گارڈ اور ویٹر نظر آرہے تھے۔ مہمانوں کے خیر مقدم کے لیے میزبان اپنے پورے جوش اور خندہ پیشانی کا مظاہر کررہے تھے۔ ہوٹل ''لیما'' شاندار طریقے سے سجا ہوا تھا۔ ایک رئیس کی شادی تھی۔ جمی کے ساتھ اس کا شوہر اندر داخل ہوا۔ کشادہ ہال کے سرے پر دولھا اور دلہن عالی شان صوفوں پر براجمان تھے۔ حسین اور جمیل عورتیں اپنے حسن کی نمائش میں مصروف تھیں۔ مرد اپنی دولت کا مظاہرہ کررہے تھے۔ جسموں پر قیمتی لباس، کلائیوں میں بیش قیمت گھڑیاں ان کی امیری کا اعلان کررہے تھے۔ جمی اپنے شوہر کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دولہا، دولہن کے قریب پہنچے ان کا خیر مقدم پہلے ہی ہوچکا تھا۔ دولہا جمی کے شوہر کا دوست تھا۔ جمی کے شوہر نے جمی کی ملاقات اپنے دوست سے اور اس کی دولہن سے کرائی۔ تحفے پیش کئے کچھ رسم دنیا نبھائی اور پھر ڈنر کے لیے چل دیئے۔ جمی کی نگاہیں اچانک ایک طرف اٹھ کر جم سی گئیں۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ ''ارے! یہ تو وہ ہے شاید۔ ہاں ہاں وہ ہی ہے۔'' اس نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔ جمی کے شوہر نے اس کے الفاظ سن لئے اور وہ بھی اس انسان کو دیکھنے لگا جو قیمتی سوٹ میں سجا ہوا کسی سے مصروف گفتگو تھا۔ جمی سے رکا نہ گیا۔ ماضی نے ایک مقناطیسی کشش کی طرح اسے اس شخص کے پاس لا کھڑا کیا۔ ہاں یہ وہ ہی تھا۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ تیز نسوانی پرفیوم کی خوشبو نے پاس موجود جمی کی طرف اس کا رخ موڑ دیا۔ جمی پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ''ارے جمی! تم یہاں؟ کیسی ہو؟ ارے زمانہ ہوگیا ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ یقین نہیں آتا کہ تم میرے پاس موجود ہو؟'' وہ آگے بھی کچھ کہتا کہ جمی کے شوہر بھی قریب آگئے۔ جمی نے اپنے شوہر سے اس کا تعارف کرایا اور پھر باتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔

وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ جیسے کہ جمی سے مل کر اسے دنیا کی ہر خوشی حاصل ہوگئی ہو۔ وہ بول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ جمی اور اس کے شوہر بھی بہت خوش نظر آرہے تھے کہ اچانک ایک اور انسان ان تینوں کے درمیان داخل ہوا۔ یہ ایک تیس سال عمر کی سیاہ فام خاتون تھی۔ موٹے ہونٹ، چھوٹا ماتھا۔ چوڑی ناک، چھوٹے چھوٹے کان اور چھوٹی بڑی آنکھیں۔ وہ خاتون ایک دو لمحے خاموش رہنے کے بعد اس سے بولی ''آپ ان لوگوں سے ہمیں نہ ملوائیے گا۔'' وہ فوراً بولا: ''ہاں، ہاں، ضرور، ضرور۔ یہ میری وائف ارونا ہیں۔'' وہ جمی کی طرف دیکھ کر بولا اور ارونا سے جمی کا تعارف کروانے لگا۔ لیکن جمی پانچ سال قبل کے زمانے میں پہنچ چکی تھی۔ ہوٹل تھا، ۔ وہ تھا اور اس کی آواز گونج رہی تھی۔ دنیا میں وہ انسان سب سے مطمئن ہے کہ جس کے پاس حسن وجمال ہے۔'' اچانک جمی چونک اٹھی شوہر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہا تھا ''جمی جمی! کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' جمی چونکی اور پھر سنبھل گئی۔ کچھ دیر تک جمی کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھہری رہیں۔ پھر اس کے ہونٹ حرکت میں آئے۔ تم واقعی ایک خاص انسان ہو۔ ❑❑❑

تشنہ لبی

راجیو پرکاش ساحر
20/84، رنگ روڈ، اندرا نگر، لکھنؤ
موبائل: 9839463095

دھوپ کی شدت ہو چلی تھی میں صبح آٹھ بجے سے کام کر رہا تھا۔ اب بارہ بجنے کو آ رہے تھے، میں پچھلے ایک ہفتہ سے کالونی کے سیکٹر دس میں کام کر رہا ہوں اور سکٹر دس کے تقریباً سبھی مکانوں کی کال بلس بجا چکا ہوں دراصل کالبل بجانا ہی میرا کام ہے۔ میں ایک مقامی مارکیٹنگ کمپنی، جو کہ واٹر پیوریفائر کی ڈائرکٹ مارکیٹنگ کرواتی ہے، میں سیلسر پیریزنٹیٹیو ہوں میرے جیسے کچھ پڑھے لکھے نوجوان شہر کے مختلف علاقوں میں گھر گھر جا کر مارکیٹنگ کمپنی کے واٹر پیوریفائرس کی مشتہری کرتے پھرتے ہیں، ان کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور ہر چند کوشش کر کے لوگوں کو کمپنی کے واٹر پیوریفائرس خریدنے پر اکساتے ہیں، آمادہ کرتے ہیں۔

واٹر پیوریفائرس یعنی پانی کو شُدھ، پاک صاف کرنے کی مشین۔ انسانی ترقّی پر آلودگی اِس قدر حاوی ہوئی ہے کہ قدرتی پانی جیسی انمول نعمت بھی زہریلی ہو کے رہ گئی ہے۔ بیماریوں کے تمام جان لیوا جراسیم اس پانی میں گُلبُلا رہے ہیں۔ یعنی جو اِسے پیئے گا۔ بیمار پڑ جائے گا۔ یعنی اب یہ پینے لائق نہیں رہ گیا ہے۔ جب یہ پانی واٹر پیوریفائرس سے ہو کر گذرتا ہے خاص طور سے میری کمپنی کے واٹر پیوریفائرس سے ہو کر گذرتا ہے تو یہ یقیناً شُدھ، پاک، صاف اور پینے لائق ہو جاتا ہے، میں پچھلے کچھ مہینوں سے اپنی کمپنی کے ایسے ہی کچھ واٹر پیوریفائرس بیچ بیچ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جدّ و جہد کر رہا ہوں۔

میں ایک قصبہی کالج سے گریجوئٹ ہوں۔ دبلا پتلا شریر، درمیانہ قد، سانولی رنگت، شکل بھی کچھ بُری نہیں ہے میری۔ میں کسان پریوار سے ہوں مگر ہوا یہ کہ کنبہ بڑھتا گیا اور کھیت گھٹتے گئے۔ والد نے محنت مزدوری کر کے مجھے بی۔اے۔ تک پڑھا دیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ میں نے کمپٹیٹیو ایکزام وغیرہ دینے میں

> کام چلاؤ انگریزی اور کوئی تکنیکی کورس یا صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے مجھے شہر میں کوئی ڈھنگ کا کام نہیں مل پا رہا تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ ایسے سخت گیر وقت میں میرے ایک رشتہ کے تاؤ جی کام آئے۔ تاؤ جی کئی سال پہلے شہر میں آئے تھے اور بجلی وائرنگ کا کام کرتے کرتے واٹر پیوریفائرس کا کام سیکھ گئے تھے اور اب ایک مقامی مارکیٹنگ کمپنی میں بحیثیت مکینک ملازمت میں تھے اور اپنی دال روٹی چلا رہے تھے۔
>
> اُنہوں نے مجھے صلاح دی۔ 'بیٹا میری کمپنی کا مال بیچنے میں لگ جاؤ۔ حکمت کے ساتھ جتن کرو گے تو کچھ نہ کچھ کمانے ہی لگو گے۔''

گنوایا۔ وقت۔ پیسہ دونوں برباد کئے ناکامیاب رہا اور پھر کسی پرائیویٹ کام یا نوکری کی تلاش میں اس مہانگری میں آ گیا۔ یہاں وی۔آئی۔پی۔ بنگلے ہیں، ملٹی اسٹوری بلڈنگس ہیں، اپر کلاس۔ مڈل کلاس اور لور کلاس کالونیز ہیں، تنگ گلیاں اور جھوپڑپٹّیاں ہیں۔ شہر میں یہاں وہاں دبے کچھ دم توڑتے گاؤں بھی ہیں۔ جگمگاتے رونق آمیز بازار، مالس، ہوٹل، میخانے، پٹری دوکاندار، خوانچہ والے کیا کیا نہیں ہے اس شہر میں۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک ندی بھی ہے، بیجان سی ندی۔ اس ندی پر کئی پُل ہیں۔ ہر روز فضاؤں میں زہر گھولتی ہوئی ہزاروں گاڑیاں اِن پُلوں کے اوپر سے اِس مردہ سی پڑی ہوئی ندی کو روندتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ شہر کے لاکھوں باشندے اِن پُلوں سے روز گذرتے ہیں لیکن اِس بدصورت ندی کی طرف اک نگاہ بھی اٹھانا گوارا نہیں کرتے۔ شہر کے نالوں اور سیوروں کی غلاظت نے ندی کو منھ دکھانے کے قابل چھوڑا ہی نہیں۔ ندی کا پانی اب کسی کام کا نہیں رہ گیا ہے سوائے اِس کے کہ اسکی حالت پر رحم کیا جائے یا پھر افسوس جتایا جائے۔ اس شہر میں میرا ایک چچیرا بھائی ہے جو رکشہ چلاتا ہے۔ اسی کے بسیرے میں بے شرموں کی طرح پڑا ہوں۔ بھائی بھابھی میری اس ہرکت سے خوش تو نہیں ہیں لیکن گاؤں جوار کے لحاظ کے مارے کچھ کہہ نہیں پاتے۔ پر میں بھی کیا کر سکتا ہوں؟ ابھی میں اتنا نہیں کما پاتا ہوں کی الگ کمرا لے سکوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ اپنے والد کو بھی بھیجنا پڑتا ہے۔ ان سے بھی اب محنت مزدوری کرتے کہاں بنتا ہے۔

کام چلاؤ انگریزی اور کوئی تکنیکی کورس یا صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے مجھے شہر میں کوئی ڈھنگ کا کام نہیں مل پا رہا تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ ایسے سخت گیر وقت میں میرے ایک رشتہ کے تاؤ جی کام آئے۔ تاؤ جی کئی سال پہلے شہر میں آئے تھے اور بجلی وائرنگ کا کام کرتے کرتے واٹر پیوریفائرس کا کام سیکھ

گئے تھے اور اب ایک مقامی مارکیٹنگ کمپنی میں بحیثیت مکینک ملازمت میں تھے اور اپنی دال روٹی چلا رہے تھے۔ اُنہوں نے مجھے صلاح دی۔ 'بیٹا میری کمپنی کا مال بیچنے میں لگ جاؤ۔ حکمت کے ساتھ جتن کرو گے تو کچھ نہ کچھ کمانے ہی لگو گے۔'' میں ایسی غیر معتبر مقامی کمپنیز کے طور طریقوں سے ناواقف نہیں تھا۔ ایسی کمپنیز میں میرے جیسے نوجوان روز بھرتی کئے جاتے ہیں اور روز بھگا دیئے جاتے ہیں یا خود با خود بھاگ جاتے ہیں۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا؟ مینیجر نے مجھ سے دو چار الٹے سیدھے رسمی سوال پوچھے اور ایک دن کی ٹریننگ کے بعد کام پر لگا دیا۔ اب مجھے گلے میں کمپنی کی ٹائی اور کندھے پر کمپنی کا بیگ جس میں واٹر پیوریفائرس کے مطالق کیٹلاگ، پمفلیٹ وغیرہ تھے لٹکا کر در در بھٹکنا تھا اور آرڈر بُک کرنے تھے۔ کام آسان نہیں تھا۔ بہت کمپیٹیشن ہے ایک کثیر تعداد ہے کمپنیز کی اِس میدان میں۔ میرے جیسے بندوں کی تنخواہ بھی کچھ نہیں ہوتی ہے۔ بس کمیشن ملتا ہے وہ بھی مال بِکنے کے بعد۔ کچھ بھی کرو، کچھ بھی سمجھاؤ، مال بکنا چاہیئے۔

''ایکسکیوز می سر! ہمارے واٹر پیوریفائرس لیٹیسٹ ہیں، بیسٹ ہیں ایک سے ایک ماڈل ہیں، پلیز سر لے لیجئے، ہمارے واٹر پیوریفائرس کا پانی گنگا جل ہے آبِ زمزم ہے! پلیز سر لے لیجئے، صحت کے لئے ضروری ہے سر، دام بھی کفایتی ہیں، پلیز سر لے لیجئے

طرح طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ طرح طرح کے مکانوں میں جانا ہوتا ہے۔ طرح طرح کے مکینوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس دھندھے میں دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کا موقع بھی خوب ملتا ہے۔

کہیں دولت کی انتہا دیکھتا ہوں تو کہیں مفلسی کی انتہا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس شہر میں سب کچھ ہے۔ نظریں صاف کرنے کیلئے چشمے ہیں، خونِ دل صاف رکھنے کے لئے پیس میکرس ہیں، صاف ہوا کے لئے ماسک ہیں اور پانی صاف کرنے کے لئے واٹر پیوریفائرس ہیں لیکن ذہنوں کو پاک صاف رکھنے کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔

، ٹارگِٹ پورا کرنا ہے نہیں تو سیلری نہیں بنے گی۔ بھوکوں مر جاؤ نگا پلیز سر اکسکیوزمی سر"۔ اکثر عاجز آ کر لوگ مجھے جھڑک دیتے ہیں، ڈانٹ دیتے ہیں۔

طرح طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ طرح طرح کے مکانوں میں جانا ہوتا ہے۔ طرح طرح کے مکینوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس دھندھے میں دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کا موقع بھی خوب ملتا ہے۔ کہیں دولت کی انتہا دیکھتا ہوں تو کہیں مفلسی کی انتہا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس شہر میں سب کچھ ہے۔ نظریں صاف کرنے کیلئے چشمے ہیں، خونِ دل صاف رکھنے کے لئے پیس میکرس ہیں، صاف ہوا کے لئے ماسک ہیں اور پانی صاف کرنے کے لئے واٹر پیوریفائرس ہیں لیکن ذہنوں کو پاک صاف رکھنے کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔

تو دھوپ کی شدّت اب شدید ہو چلی ہے۔ کہیں کوئی سایہ بھی نہیں ہے۔ پیاس بہت لگی ہے مگر پانی کا بہت رونا ہے اس دنیا میں۔ کہیں پانی افراط بہر رہا ہے تو کہیں نلوں پر لائن لگی ہے۔ تو کہیں دو بوند پانی بھی میسّر نہیں ہے۔ گاؤں کی یاد آتی ہے، گاؤں میں بھی تو ندی نالے کویں پوکھر یا تو سوکھ گئے ہیں یا گندلا گئے ہیں۔ گاؤں میں بھی تو پینے کے صاف پانی کی دشواری ہے۔ گاؤں میں پانی کون صاف کریگا؟ میں تو یہاں شہر میں، پانی صاف کرنے کے دھندھے میں اُلجھ کے رہ گیا ہوں۔ □□□

'نیا دور' کے جولائی ۲۰۱۷ء کے شمارے کی ایک جھلک

ترقی پسند تحریک کے اہم ستون اور مشہور نقاد ڈاکٹر قمر رئیس

کے ۸۵ ویں یوم ولادت کے موقع پر ڈاکٹر سلمٰی شاہین اور نفیس عبدالحکیم کے مضامین

زیب اختر، طارق شاہین اور حمیرا عالیہ کے افسانے

نعمان شوق، قرار زہرا، نصرت مہدی، خوشتر رحمانی، گمان انصاری اور نثار رضوی کی غزلیں

سدرشن بششٹ کی ہندی کہانی، مراٹھی ناول 'ایندھن' کی اگلی قسط، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات

سیا سچدیو
A-98، راجندر نگر، بریلی
موبائل: 8958451421

گمشدہ وقت

صرف تیری تلاش رہتی ہے
عکس ہر وقت آ کے تیرا ہی
من کے آنگن میں رقص کرتا ہے
جیسے کوئی اداس سی خوشبو
میرے تن من میں پھیل جاتی ہے
لوٹ جاتی ہوں اپنے ماضی میں
تیری یادیں ترے خیال لئے
وہ سبھی دن، مری وہ سب راتیں
یاد آتی ہیں تیری سب باتیں
وقت پھر آ کے تھم سا جاتا ہے
دھڑکنیں دل کی رک سی جاتی ہیں
پھر اچانک سہم سی جاتی ہوں
ٹوٹ کر میں بکھر سی جاتی ہوں
حسرتیں اپنی اپنے خوابوں کو
اس طرح پھر سمیٹ لیتی ہوں
تیری یادیں لپیٹ لیتی ہوں
بیٹھ کر پھر یہ سوچتی ہوں میں
گمشدہ وقت لوٹتا ہے کیا

غزل

پارسائی ہے شرافت ہے حیا ہے مجھ میں
لوگ کہتے ہیں انا ہے تو انا ہے مجھ میں

اب خوشی ہو، کہ کوئی غم ہو بھلے ہیں دونوں
زندگی تیرا ہر اک رنگ جدا ہے مجھ میں

پہلے ہر بات پہ ہنستی تھی میں خوش ہوتی تھی
اب یہ احساس کہیں کھو سا گیا ہے مجھ میں

وہ تمنا کے کھلونے تھے کہ امید کی ڈور
کچھ نہ کچھ ہے جو کہیں ٹوٹ گیا ہے مجھ میں

ڈھونڈتی پھرتی تھی میں سارے زمانے میں جسے
آنکھ موندی تو وہی آج ملا ہے مجھ میں

اب میں چاہوں تو بنا لوں گا نشانہ تجھ کو
ایک انجان شکاری کی صدا ہے مجھ میں

ڈسنے لگتی ہے مجھے شہر کی ساری رونق
جانے کس دشت کا سناٹا چھپا ہے مجھ میں

ظلم کا قد نہ گھٹا ہے کہ گھٹے گا اے سیاؔ
ہاں مگر حوصلہ لڑنے کا بڑھا ہے مجھ میں

فوزیہ فاروقی
58 سلے بیک، پرنسٹن جنکشن
نیوجرسی 08550، امریکہ

میری ماں

میری آنکھیں
میرے اقرار سے روشن ہیں
اور میرا لہو
میرے انکار سے
میرے ہاتھوں پر وقت بندھا ہے
اور ہونٹوں پر آگ
میں اپنے جسم پر ستارے ٹانکتی ہوں
اور آسمان میں پھول کھلاتی ہوں
میری ماں
میرے حصے کی روٹیاں پکا چکی ہے

گوشت جلنے کی مہک

کیا ہولناک منظر ہے
کٹے پھٹے ہونٹ
ہانپتے جسم
مردہ آنکھیں
سیاہ مکروہ انگلیاں
ایک دوسرے میں الجھتی ہیں
دو بدن
ایک دوسرے پر جھپٹتے ہیں
چمگادڑوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ
فضا میں سنائی دیتی ہے
اور گوشت جلنے کی مہک سے
کمرہ سلگ اٹھتا ہے

آہ ورجینیا...!!

(ورجینیا ولف کے لئے)

آہ ورجینیا!
مجھے تم پر رشک آتا ہے
تمہاری معصومیت پر
تمہاری دھوکا کھانے کی عظیم صلاحیت پر
ان دیکھے کو تسلیم کر لینے کی طاقت پر
تم خاموشی سے
جیبوں میں پتھر بھرے
گہرے پانیوں میں اتر گئیں
تم نے یقین یا بے یقینی کی
نامانوس منزل کو گلے لگا لیا

ہم کیا کریں ورجینیا.....ہم
کہ ہمارے پاس اپنا کمرا ہے
جس میں ہماری اجازت کے بغیر
کوئی داخل نہیں ہوتا
اور اک دراز
جس میں بے شمار رنگ ہیں
لیکن.....
ہماری لامحدود حسیت
ان کے فرق کو تسلیم نہیں کرتی
ہمارے لئے تو سمندر بھی ناکافی ہے
اور ہمارے لئے
موت بھی اتنی ہی بے معنی ہے
جتنی کہ زندگی
آہ ورجینیا!

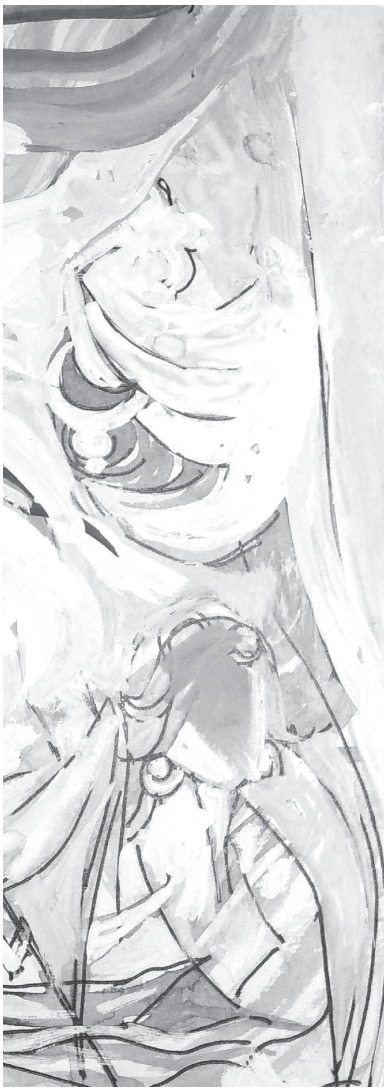

دن ڈوب گیا

دن ڈوب گیا
اک اور نیا دن ڈوب گیا
کیا رنگ ہواؤں میں بکھرے
یا گیت ہی کوئی دہرایا
کیا کسی نے ہم کو یاد کیا
یا کوئی ہمیں ہی یاد آیا

کیا کسے خبر، اب کون سنے
دل میں جو ادھورے قصے ہیں
جو بے مطلب سی باتیں ہیں
کچھ کرچیں ہیں، کچھ آئینے
کچھ کٹی پھٹی سی تصویریں

اب یاد نہیں، کچھ یاد نہیں
کچھ یاد نہیں کب جاگے تھے
بے معنی رات بتانے کو
کچھ یاد نہیں کب نکلے تھے
ہم خود سے دھوکا کھانے کو
اک دریا ہے، جو بہتا ہے
سب ساتھ بہالے جاتا ہے
جذبات بہالے جاتا ہے
دن رات بہالے جاتا ہے
ہاں ایک کسک رہ جاتی ہے
اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے
دن ڈوب گیا
اک اور نیا دن ڈوب گیا

سراج اجملی
شعبۂ اردو، علی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
موبائل: 9118930991

نیوڈ کلچر

قبا نے جسم کو زبان بخش دی
وگرنہ بے زبان جسم
بے توجہی کے نشتروں سے زخم زخم ہو کے رزق خاک تھا
اب
اہالیانِ جسم کو ہے مستقل
قبا گروں کی جستجو
مگر نہ جانے کیوں
قبا گروں کا قحط ہے

عجیب بات

بنام خواہشِ وصال وشوقِ اتصال
تم نے
کشت جسم میں
کاشت کی تو زہر اور صرف زہر کی
اب اسی سے تم
نتیجہ چاہتے ہو
انگبیں کا شیر کا
بہت عجیب بات چاہتے ہو تم

غزل

الجھنیں، بے قراریاں، دن میں سکوں نہ رات میں
غرق ہے میری زندگی، ورطۂ حادثات میں

کشمکش نشاط و غم، فکر تلاش بیش و کم
موڑ ہیں سیکڑوں یہاں، مرحلۂ حیات میں

شہر صلیب و دار میں جینا وبالِ جان ہے
تھوڑا سکوں بھی چاہئے عالم بے ثبات میں

چہرہ ہے کیوں اڑا ہوا، آنکھیں ہے کیوں جھکی ہوئی
آپ کا ذکر تو نہیں، میری نگارشات میں

ہم بھی نقیب امن ہیں، ہم بھی ہیں صاحب نظر
ہم سے بھی مشورہ کرو مسئلۂ نجات میں

شہر ہے مقتل بشر، خون میں ڈوبے خشک و تر
ہیں سارے دیوتا خموش، گوشۂ سومنات میں

برگ و ثمر اداس اداس، شاخ و شجر خموش تھے
آپؐ نے رنگ بھر دیا گلشنِ کائنات میں

ذکرِ حضور ہی رہا حاصل گفتگو ندیمؔ
کوئی مزہ نہ کیف و رنگ، لالہ وگل کی بات میں

ڈاکٹر امتیاز ندیمؔ
ڈومن پورہ، نعمانی گیٹ، مئوناتھ بھنجن
موبائل: 8090645363

غزل

ہجر کو وصل کے امکان بتاتے ہوئے ہم
یوں ہی مر جائیں ترا عشق نبھاتے ہوئے ہم

وہ شرارے سا بدن دہکے سے رخسار و لب
جی تو کرتا ہے کہ جل جائیں بجھاتے ہوئے ہم

اتنے کمزور سپاہی تھے کہ اس لشکر پر
اچھے لگتے نہیں، شمشیر اٹھاتے ہوئے ہم

پہلے ہم ہی تو تھے آمادہ، محبت کر لیں
بھاگتے پھرتے ہیں اب جان چھڑاتے ہوئے ہم

اتنے میٹھے سے تھے وہ ساتھ گزارے ہوئے پل
ہنسنے لگتے ہیں ترا درد جگاتے ہوئے ہم

پھیکا کر بیٹھے تھے ہم رنگ تعلق اپنا
اور زیادہ ہی اثر دار بناتے ہوئے ہم

اب وہاں دشت، نہ ساونؔ، نہ کوئی قیس بچا
پائے جاتے تھے جہاں خاک اڑاتے ہوئے ہم

ساونؔ شکلا
611/18، ایڈوکیٹ کالونی، چندرودائی نگر، اجمیر، راجستھان
موبائل: 9558712800

اودھ پنچ اور دیگر جرائد

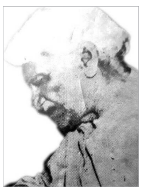

مرزا جعفر حسین
۱۸۹۹ ۱۹۸۹

زبان و بیان کی خوبیوں میں نکھار پیدا کرنے، عوام کے فطری جذبات کو صحیح اور کارآمد عملی شاہراہوں پر آمادہ کرنے، رجحانات و احساسات کی راست نمائی کرنے، عوام میں قوت ارادی اور قوت عمل کو تقویت فراہم کرنے اور مظلوموں کے شکستہ دل کو سہارا دینے کے لئے صحافت ایک زبردست، موثر اور سودمند وسیلہ ہے۔ سیاسیات کے میدان میں صحافت کی بہت زیادہ کارفرمائی ہوتی ہے لیکن اخلاقیات و معاشیات کے مبادیات میں بھی اس فن کو کم اہمیت نہیں ہے۔ لکھنؤ کے قدیم معاشرہ میں گو کہ سیاست کو خواص و عوام کی زندگی میں کوئی مقام حاصل نہیں تھا لیکن صحافت کی افادیت اس وقت بھی مسلم الثبوت تھی۔ تعیش اور فارغ البالی کے دور میں جب زندگی بسر کرنے کے انداز سہل انگاری پر قائم تھے، سماج کو نئے رخ کی طرف اودھ اخبار ہی نے موڑ دیا تھا اور اس نئی ذہنیت کی تربیت میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد اور اودھ اخبار کی حالات زمانہ سے باخبر کرنے کی کوششوں کو دخل تھا۔ ان دونوں کے صحت مند اثرات نے اردو زبان کو نکھار دیا اور عوام کو متاثر کر کے اخلاق و کردار کو بلند کرنے میں سہارا دیا تھا۔

فسانۂ آزاد نے نہ صرف قدامت پسندوں کے لئے آسودگی و دلچسپی کا سامان فراہم کیا تھا بلکہ نوجوانوں میں بھی ناول بینی کا نیا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ اسی مذاق کی بدولت ادیبوں اور نثر نگاروں نے بڑے بڑے شاہکار پیش کئے جو مقبول خاص و عام ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے تاریخ ناول لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت پارینہ کی یاد تازہ کی اور ان میں نئے حوصلے پیدا کئے۔ بعض دوسرے فنکاروں نے بھی ناول لکھے جن کے صحت مند اثرات سماج کے اخلاقیات پر پڑے تھے۔ اس زمانے کی معاشرت کی صحیح عکاسی مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنے ناول 'امراؤ جان ادا' میں کی جو آج تک ناول نویسی کی دنیا میں ایک بلند پایہ شاہکار ہے۔

اسی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ یہی ناول پڑھنے کا شوق عوام میں پھیلا تو بازاری مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے سطحی اور پست تصنیفات بھی کثرت سے معرض وجود میں آئیں۔ رومان پرستی کی آسودگی کے لئے ویسا ہی ادب درکار تھا۔ یہ شوق شہر کے ایک ممتاز پبلشر مہادیو پرشاد ٹنڈن کے تجارتی کاروبار سے پورا ہوتا تھا۔ ان کے مطبوعہ ناولوں میں فکر و فن کی خوبیاں بہت کم تھیں لیکن سستی رومانیت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ان ناولوں کی بدولت عوام میں بہت چہل پہل رہتی تھی اور ایک گونہ ادبی گرم بازاری بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ مثال کے طور پر ایک ناول کا یہ پلاٹ تھا کہ ایک نوجوان قیصر باغ کے چوراہے پر ایک پھول دار ریشمی رومال پڑا ہوا پاتا ہے جو اس کے قیاس میں کسی حسینہ کا تھا پھر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ جس کا رومال اتنا خوبصورت تھا وہ خود کتنی حسین و جمیل اور نازک اندام ہوگی۔ اس کے دماغ میں ایک حسن و جمال کا مجسمہ تیار ہوتا ہے اور اس کی نظریں اس پری پیکر کے نظارے کے لئے بیتاب

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل جوجھتا رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی ایک تحریر 'مشاعرے' حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

ہوجاتی ہیں۔ معاً وہ نادیدہ معشوق پر عاشق ہوجاتا ہے اور اس کی تلاش میں آوارہ گرد ہوکر جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا ہے۔ یہ ناول اس زمانے میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ زبان و بیان کے اسلوب اور منظر نگاری میں اس کا پایہ بلند تھا لیکن پھر بھی اس کا شمار کسی بلند پایہ ادب میں نہیں ہوسکتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ذوق باقی نہیں رہا اور ایسے کمتر درجہ کی تخلیقات نے اپنی جگہ بلند پایہ ادب کے لئے خالی کر دی۔ ایسے پست لٹریچر کا پھر بھی ایک مقام تھا کیونکہ فکر و نظر نے اسی زینہ کو طے کر کے رفعت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ اردو زبان کو سنوارنے میں ایسے بے فیض ادب کا بھی گرانقدر حصہ تھا۔ ایسے ہی افسانے اس زمانے کے اخباروں اور رسائل میں بھی شائع ہوتے رہتے تھے جن کی افادیت صرف اسلوب زبان تک محدود تھی۔

اودھ اخبار میں ابتداً زیادہ تر غزلیں اور افسانے جن کو رومانی کہانیاں کہنا زیادہ صحیح ہوگا، شائع ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ خبروں کی تعداد میں اضافہ ہوا مگر یہ خبریں بھی عموماً سرکاری یا سرکار سے متعلق ہوتی تھیں۔ سیاسیات کا ایسا کوئی شائبہ جو قومیت یا وطن پرورانہ رجحانات سے متعلق ہو، اس میں نہیں ہوتا تھا البتہ شستگی، زبان اور سلاست بیان اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نقش اول کے بعد پھر اور دوسرے نقش بھی ابھرے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اخبارات و رسائل نے مذہبیات کو بھی اپنے موضوعات میں شامل کرلیا تھا۔ پھر بھی اخبار بینی کا کوئی قابل ذکر شوق شہر کی پرانی آبادی کو پیدا نہیں ہوسکا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران خواص و عوام اخبار پڑھنے کے شائق ہو گئے تھے۔ شبیر حسن قتیلؔ مرحوم نے ستارہ جاری کیا تھا جو بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا تھا اس زمانے کے حالات کا دقیق نظر سے جائزہ لیا جائے تو کچھ ایسا محسوس ہوگا کہ غلام ہندوستانیوں کے رگ حمیت پہلی بار پھڑکی تھی اور ان میں غیر متعین اور غیر شعوری طور پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرا تھا۔ امراء و رؤسا کے درباروں میں جنگ کے اذکار سن کے کانوں پر ہاتھ دھر لئے جاتے تھے لیکن عوام کی زبان پر یہ شعر ورد رہتا تھا:

> فسانۂ آزاد نے نہ صرف قدامت پسندوں کے لئے آسودگی و دلچسپی کا سامان فراہم کیا تھا بلکہ نوجوانوں میں بھی ناول بینی کا نیا مذاق پیدا کر دیا تھا۔ اسی مذاق کی بدولت ادیبوں اور نثر نگاروں نے بڑے بڑے شاہکار پیش کئے جو مقبول خاص و عام ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے تاریخ ناول لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی عظمت پارینہ کی یاد تازہ کی اور ان میں نئے حوصلے پیدا کئے۔ بعض دوسرے فنکاروں نے بھی ناول لکھے جن کے صحت مند اثرات سماج کے اخلاقیات پر پڑے تھے۔ اس زمانے کی معاشرت کی صحیح عکاسی مرزا محمد ہادی رسوا نے اپنے ناول 'امراؤ جان ادا' میں کی جو آج تک ناول نویسی کی دنیا میں ایک بلند پایہ شاہکار ہے۔
>
> اسی تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ یہی ناول پڑھنے کا شوق عوام میں پھیلا تو بازاری مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے سطحی اور پست تصنیفات بھی کثرت سے معرض وجود میں آئیں۔ رومان پرستی کی آسودگی کے لئے ویسا ہی ادب درکار تھا۔

ہر طرح ہے شکست جرمن کی
بجز اس کے کہ بڑھے آتے ہیں

پھر بھی اس زمانہ کے بارے میں صرف اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ باوجود فارغ البالی وارزانی اور امن و امان کے عوام کے لئے حکومت برطانیہ کا اقتدار ناخوشگوار تھا اور اسی جذبہ کو 'سیارہ' نیز بعض شعراء کی نظموں نے وقتی طور پر گرما دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ظریفؔ کی ایک نظم جس کا مطلع یہ تھا، بہت زیادہ مرغوب خاطر تھی۔

ہم لوگ ہیں افیونی جب رنگ جما دیں گے
جرمن تری توپوں میں ہم بانس چلا دیں گے

ان جذبات کو پھر بھی کوئی دیرپا حیثیت حاصل نہیں تھی اور نہ عوام کے پیش نظر کوئی معینہ مقصد تھا جس پر ان کی تنظیم ہوسکتی۔ ان کے دلوں میں اس وقت تک انتزاعِ سلطنت کا داغ تازہ تھا اور وہ انگریزوں کو ظالم و غاصب سمجھ کر ان سے خائف تھے اور نفرت بھی کرتے تھے۔ تحریک خلافت نے پہلی بار انہیں جذبات کو ایک عملی دھارے میں موڑ دیا تھا۔

اس تجزیہ کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے پرانے اخبار و جرائد نے اردو کو فروغ دینے کے علاوہ اصلاحی اور تعمیری مبادیات میں کوئی گہرا نقش نہیں ابھارا تھا البتہ ایک رسالہ اودھ پنچ ایسا تھا جس نے ادبی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور آگے چل کر سیاسی معاملات میں بھی رہنمائی کی تھی اور اپنے دیرپا اثرات بھی قائم کئے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح کے سنجیدہ اسلوب کا اردو ادب میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس جریدہ کو ابتدا ہی میں باصلاحیت مقالہ نگار مل گئے تھے اور یہی سلسلہ آخر وقت تک برقرار رہا تھا۔ منشی سجاد حسین بانی اور ایڈیٹر تھے جن کے کلام و بیان میں بلا کی شوخی بھری ہوئی تھی اور وہ خود بھی بہت خوش اخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔ دوسرے مقالہ نگاروں میں مرزا مچھو بیگ، منشی احمد علی کسمنڈوی اور پنڈت تربھون ناتھ ہجرؔ شامل تھے۔ ان میں کا ہر فرد عالم، فاضل اور بلند پایہ صلاحیت کا مالک تھا۔ مرزا مچھو بیگ طنز و مزاح کے ساتھ شیریں زبان میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ منشی احمد علی فارسی ادب کے ماہر اور بذلہ سنج تھے۔ ہجر کو ہندی شاعری پر عبور حاصل تھا اور وہ ہندی اور اردو میں حسین امتزاج پیدا کرنے کے قائل تھے۔ ظاہر ہے کہ ان جدا جدا

خصوصیات کے ادیبوں کا یکجا ہوکر اپنے اپنے کمالات کے نمونے پیش کرنا اودھ پنچ کی ہر دلعزیزی اور افادیت کے لئے کافی تھا۔ چنانچہ یہ جریدہ بہت جلد بلند پایہ ادیبوں میں مقبول ہو گیا تھا۔ ادبیت کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کی چاشنی نے اس کی دلکشی کو دوبالا کر دیا تھا۔ علمی اور ادبی مباحثوں کے لئے اس کے کالم مخصوص تھے، اس طرح باوجود ظرافت کے سنجیدگی کا جوہر بھی اس میں شامل ہو گیا تھا۔

اودھ پنچ کا پہلا دور منشی سجاد حسین کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ بھی ایک ایک کر کے راہیٔ ملک بقا ہو گئے تھے۔ اس جریدہ کی بقا کا مرحلہ بہت سخت تھا۔ اس مصیبت میں شیخ ممتاز حسین عثمانی مرحوم نے جو پہلے سے شریک کار تھے، اس خدمت کو انجام دینے کا فریضہ قبول کیا۔ وہ منشی سجاد حسین کے دوست اور ہم مذاق بھی تھے۔ انہوں نے اپنی ادارت میں اس موقر اخبار کا وجود اپنی سابقہ افادیت سمیت برقرار رکھا۔ اسی زمانہ میں راقم کو بھی ان کی ظریفانہ صحافت سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اخبار کا دفتر وکٹوریہ اسٹریٹ سے متصل دلالی محلہ میں تھا اور اسی مکان میں شیخ ممتاز حسین عثمانی بھی رہتے تھے۔ شیخ صاحب مرحوم عقیدتاً شیعہ تھے لیکن اخباری مسلک تھا۔ شیعوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا تھا جو اپنے علم وعقل کے سرمایہ کو تقلید کے آستانے پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھے لہٰذا علمائے کرام سے ان کا تصادم ناگزیر ہو گیا تھا۔ راقم کا تعلق بھی اسی جتھے سے تھا اور ہم سب کے سپہ سالار شیخ ممتاز حسین مرحوم تھے۔ اس طرح مذہبی رسم ورواج میں بھی اصلاح کے پہلو نکالنے اور ان کی ترویج کرنے کے لئے اودھ پنچ ایک بڑا سہارا بن گیا تھا۔ شیخ صاحب کے قلم میں بانکپن تھا اور سپہ گری کی شان بھی۔ بڑے بڑے فقہی مجادلے ہوتے تھے اور شیخ صاحب فاتحانہ انداز میں معرکہ آرائی فرماتے تھے۔

شیخ ممتاز حسین عثمانی تحریک خلافت کے زمانہ سے گاندھی جی کے موئید ہو گئے تھے ٹھیک۔ وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے سب سے پہلے بدیشی اشیا کا استعمال اپنے اوپر ناجائز قرار دیا تھا اور لباس میں کھادی پہننا اختیار کر لیا تھا۔ اس سیاسی مسلک پر عامل ہونے کے باوصف ان کی صحافتی دیانتداری نے ان کو

اودھ پنچ کا پہلا دور منشی سجاد حسین کے انتقال کے بعد ختم ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ بھی ایک ایک کر کے راہیٔ ملک بقا ہو گئے تھے۔ اس جریدہ کی بقا کا مرحلہ بہت سخت تھا۔ اس مصیبت میں شیخ ممتاز حسین عثمانی مرحوم نے جو پہلے سے شریک کار تھے، اس خدمت کو انجام دینے کا فریضہ قبول کیا۔ وہ منشی سجاد حسین کے دوست اور ہم مذاق بھی تھے۔ انہوں نے اپنی ادارت میں اس موقر اخبار کا وجود اپنی سابقہ افادیت سمیت برقرار رکھا۔ اسی زمانہ میں راقم کو بھی ان کی ظریفانہ صحافت سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اخبار کا دفتر وکٹوریہ اسٹریٹ سے متصل دلالی محلہ میں تھا اور اسی مکان میں شیخ ممتاز حسین عثمانی بھی رہتے تھے۔ شیخ صاحب مرحوم عقیدتاً شیعہ تھے لیکن اخباری مسلک تھا۔ شیعوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا تھا جو اپنے علم وعقل کے سرمایہ کو تقلید کے آستانے پر قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تھے لہٰذا علمائے کرام سے ان کا تصادم ناگزیر ہو گیا تھا۔ راقم کا تعلق بھی اسی جتھے سے تھا اور ہم سب کے سپہ سالار شیخ ممتاز حسین مرحوم تھے۔

کبھی یہ اجازت نہیں دی کہ وہ اودھ پنچ کی معینہ پالیسی کو ترمیم کر کے سیاسیات بھی اس میں شامل کر دیں لیکن انہوں نے اس موضوع کو سماجی اور معاشرتی ڈھانچے میں پیش کرنے کا طرز نکال لیا تھا اور اخبار میں عالم ارواح سے جان عالم واجد علی شاہ کے خطوط بنام حکومت برطانیہ کا ایک سلسلہ مدت تک شائع کیا تھا۔ یہ خطوط یہ صرف دلچسپ بلکہ پرمغز اور دلگداز ہوتے تھے اور خواص وعوام سب ہی میں مقبول ہوتے تھے۔ ان کا یہ اثر فی الفور ظاہر ہو گیا تھا کہ عمائدین کے یہاں نوجوانوں میں انگریزوں کے خلاف بےزاری کا جذبہ شدت کے ساتھ ابھر آیا تھا۔

اس زمانہ کے حالات کے تحت یہ بھی ایک گرانقدر کارنامہ تھا جس کو ہم وطن پرور تحریکات کا پیش خیمہ قرار دے سکتے ہیں۔ شیخ ممتاز حسین کا یہ کمال تھا کہ وہ اپنے قلم سے مفاد ملک میں زندگی بھر قومی تحریکات کی حمایت کرتے رہے لیکن پھر بھی سیاسیات سے علیٰحدگی کے مسلک پر آنچ نہیں آنے دی۔

شیخ صاحب ہفت خواں تھے۔ ان کو اردو، فارسی، عربی، لاطینی، سریانی، انگریزی اور عربی زبانون پر مہارت حاصل تھی۔ اول الذکر تین زبانوں میں کمال حاصل تھا۔ اسی ادبی مذاق وشغف کی بدولت ان کے دوستانہ تعلقات تمام ہم عصر علماء، شعراء اور ادیبوں سے تھے جن میں ہر ایک ان کا احترام کرتا تھا۔ دبستان لکھنؤ میں شعر وشاعری کا وہ بہترین دور تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کے درمیان بڑے بڑے مجادلے اور مباحثے بھی ہوتے تھے جن میں یاس عظیم آبادی کا تمام اساتذۂ لکھنؤ کے خلاف مجادلہ اور چکبست وشرر کا گلزار نسیم سے متعلق مباحثہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ شیخ صاحب اور اودھ پنچ ان سرگرمیوں سے کنارہ کش نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ سے متعلق اس جریدہ کی فائلیں دلچسپ ادبی مطالعہ فراہم کرتی ہیں۔ شیخ صاحب کے دورِ کارکردگی میں منشی سجاد حسین کی ظرافت یقیناً کارفرما نہیں تھی لیکن انہوں نے ایک مجدد کی حیثیت سے علمی مباحث کو ظرافت کے کوزہ میں پیش کیا تھا۔ یہ کارنامہ یقیناً بہت گرانقدر تھا اور اس ادبی ومعاشرتی خدمت کو وہ اپنی زندگی بھر جب تک کہ زبان میں گویائی اور قلم میں یارائی رہی، انجام دیتے رہے تھے۔ تب دق کی بیماری

لاحق تھی، منہ سے برابر خون آیا کرتا تھا، بخار کی شدت سے بے بس ہو جاتے تھے لیکن جب بھی افاقہ ہو جاتا جہاد نفس میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، ان کی یہ خدمات یقیناً جہاد کی حیثیت رکھتی تھیں کیونکہ ان کی بدولت ان کو ہر طرح کی صعوبتیں اٹھانا پڑی تھیں۔

اودھ پنچ کا ہم عصر اور مد مقابل ایک دوسرا جریدہ پیامِ یار تھا، جو بہت مقبول تھا۔ اودھ پنچ کا طرز طنزیہ و مزاحیہ تھا لیکن پیامِ یار سنجیدہ ادبی میگزین تھا۔ ایک زمانہ میں ایک دونوں گرانقدر رسالوں میں زبردست تصادم ہوا تھا۔ مولانا عبد الحلیم شرر نے یہ بحث چھیڑ دی تھی کہ مثنوی گلزار نسیم حقیقتاً خواجہ حیدر علی آتش کی لکھی ہوئی تھی جس کو انہوں نے اپنے عزیز شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کا مرتبہ بڑھانے کے لئے انہیں کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔ پنڈت برج نارائن چکبست فی الفور مقابلہ پر آمادہ ہوئے۔ دونوں جانب ہم نوا شاعروں اور ادیبوں کی ٹولیاں جمع ہو گئی تھیں۔ ایک مدت تک یہ ادبی معرکہ گرم رہا تھا۔ شرر کے دعوے کی دلیلیں پیامِ یار میں چھپتی تھیں جن کے جوابات مزاحیہ انداز میں اودھ پنچ میں شائع ہوتے تھے۔ وہ زمانہ لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے بڑے لطف سے گزرا تھا۔

یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ طرفین میں کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی اور نہ کبھی کسی مضمون میں ذاتیات پر حملہ ہوا۔ فرقہ واریت کا شائبہ بھی نہیں آنے پایا تھا۔ ان مباحثوں میں اتنی افادیت تھی کہ جب مولانا مرحوم کی دیانتدارانہ طبیعت اور منصفانہ تحقیقی نظر نے چکبست کے دلائل تسلیم کر لئے تو ان تمام موافق و مخالف مقالوں کا مجموعہ کتابی شکل میں 'معرکۂ شرر و چکبست' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ختم بحث کے بعد ایک نظم یا غزل غالباً پیام یار ہی میں شائع ہوئی تھی جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

'پیامِ یار نے دونوں کو رسوا کر دیا'

اسی دور کا ایک موقر اور بہت مقبول ماہنامہ 'دل گداز' تھا جو مولانا شرر نکالتے تھے۔ انہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ادبی تخلیقات پیش کرنے کے لئے بیک وقت دو رسالے شائع کئے تھے۔ دوسرے کا نام 'مہذب' تھا لیکن یہ جریدہ بہت دنوں تک نہیں چل سکا البتہ دل گداز سے مولانائے محترم کو قلبی لگاؤ تھا۔ وہ جب حیدر آباد تشریف لے گئے تھے تو وہاں سے بھی دل گداز جاری کر دیا تھا پھر ان کا اپنی ملازمت کے تحت لندن جانا ہوا تو یہ ماہنامہ بند ہو

اودھ پنچ کا ہم عصر اور مد مقابل ایک دوسرا جریدہ پیامِ یار تھا، جو بہت مقبول تھا۔ اودھ پنچ کا طرز طنزیہ و مزاحیہ تھا لیکن پیامِ یار سنجیدہ ادبی میگزین تھا۔ ایک زمانہ میں ایک دونوں گرانقدر رسالوں میں زبردست تصادم ہوا تھا۔ مولانا عبد الحلیم شرر نے یہ بحث چھیڑ دی تھی کہ مثنوی گلزار نسیم حقیقتاً خواجہ حیدر علی آتش کی لکھی ہوئی تھی جس کو انہوں نے اپنے عزیز شاگرد پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کا مرتبہ بڑھانے کے لئے انہیں کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔ پنڈت برج نارائن چکبست فی الفور مقابلہ پر آمادہ ہوئے۔ دونوں جانب ہم نوا شاعروں اور ادیبوں کی ٹولیاں جمع ہو گئی تھیں۔ ایک مدت تک یہ ادبی معرکہ گرم رہا تھا۔

گیا مگر واپسی پر پھر تجدید کی۔ بالآخر جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو دل گداز اور لکھنؤ توام ہو گئے۔ مولانا شرر کو دل گداز سے اتنی وابستگی اور اس کی اشاعت کو بار بار جاری کرنے میں والہانگی غالباً اس وجہ سے تھی کہ ان کے تصنیف کردہ ناول بالاقساط اسی ماہنامہ میں ابتداً شائع ہوتے تھے۔ 'مہذب' میں تہذیب و اخلاق کے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے اور علمائے اسلام کی سوانح عمریاں بھی پیش ہوتی تھیں جن کا واحد مقصد دین کے پردے میں تعلیم اخلاق تھا۔ اس کے برعکس دل گداز میں پہلے ہی ان کی معرکہ آرا تصنیف 'ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ' شائع ہوئی تھی جس نے نہ صرف مولانا کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا تھا بلکہ اس ماہنامہ کو بھی بڑی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل کرا دی تھی۔ یہی شرف قبولیت اس صورت حال کا ضامن ہوا تھا کہ دل گداز متعدد بار بند ہوا اور پھر جاری ہو کر خواص و عوام میں مرجعیت باقی رکھ سکا۔ شاعر اور ادیب، علماء اور فضلاء، اس کی اشاعتوں کے منتظر رہتے تھے اور بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

جس دور کا ہم تذکرہ پیش کر رہے ہیں، اس زمانے میں بہت سے ہفتہ وار اور ماہنامے نکلے اور بند ہو گئے تھے۔ علم و ادب کا اتنا ذوق تھا کہ جو جریدہ یا رسالہ شائع ہوتا تھا، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا تھا لیکن ان سب کی بہار وقتی تھی اور ان کی افادیت بھی دیر پا نہیں تھی۔ ان کی اشاعتیں اردو ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کر دیتی تھیں لیکن زمانہ تغیر پذیر تھا اس لئے تخلیقات بھی زوال پزیری پر آمادہ تھے پھر بھی ماہنامہ 'الناظر' اور ہفتہ وار 'سچ' کا کچھ نہ کچھ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کی افادیت دیر پا تھی۔

'الناظر' کے بانی، مالک اور ایڈیٹر مولانا ظفر الملک تھے۔ ان کا تعلق کاکوری کے ایک مقتدر مخدوم زادہ گھرانے سے تھا، ان کا اصل نام اسحٰق علی تھا لیکن وہ اپنے تاریخی نام ظفر الملک ہی سے مشہور ہوئے۔ کاکوری اس زمانہ میں علم و فضل کا مرکز تھا۔ مولانا کو مبدا فیاض نے علم و فضل کا ذوق دے کر پیدا کیا تھا اور وہ بچپن ہی سے درس و تدریس کے پرستار تھے۔ علوم مشرقیہ میں کمال حاصل کیا اور اپنے شوق سیر و سیاحت میں ہانگ کانگ گئے تو وہاں سے بی اے پاس کر کے لوٹے۔ اس زمانہ میں بی اے پاس کے لئے بڑی ملازمت کا مل جانا سہل تھا لیکن ان کی غیور طبیعت اور آزادانہ روش ملازمت کی لعنت قبول نہیں کر سکتی تھی۔ سفر سے واپسی پر انہوں نے اپنے کسب معاش کے

لئے کتب فروشی کا پیشہ اختیار کیا اور ماہنامہ 'الناظر' کا اجرا کر دیا۔ ابتداً دوست خاں بہادر سید احمد حسین رضوی کی قربت میں منتقل ہو گئے تھے۔ فرض شناسی ان کی طینت میں اور دیانت داری ان کے خمیر میں شامل تھی۔ اس لئے وہ کتب فروشی کا کاروبار بہت خوش اسلوبی اور کامیابی سے چلاتے رہے لیکن 'الناظر' سے بھی کچھ کم شغف نہیں تھا۔ مضامین کی فراہمی، ان کی ترتیب و تدوین، کتابت و طباعت کے انتظامات، یہ جملہ امور پھر بھی ان کے شایان شان تھے لیکن اشاعتوں کی کاپیوں پر نام اور پتے لکھوانا، ٹکٹ چسپاں کرنا اور ان کو باحتیاط ڈاکخانہ بھجوانا یہ کام بھی انہیں کی نگرانی اور موجودگی میں انجام پاتے تھے۔

'الناظر' کا ثقافتی معیار بہت بلند تھا۔ کج بحثی یا ذاتیات تو درکنار، سطحی اور پست درجہ کے مضامین کو بھی اس کے صفحات میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ مولانا ظفر الملک مناقشات سے خواہ وہ ادبی ہی کیوں نہ ہو، خود بھی دور رہنے کے قائل تھے لیکن ایک وقت ایسا آ گیا تھا جب وہ اس احتیاط کو برقرار نہیں رکھ سکے تھے اور ان کا ماہنامہ انہیں کے دو دوستوں کے درمیان ایک ادبی معرکہ کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ ایک طرف ان کے مخلص دوست اور مایۂ ناز ادیب مرزا محمد عسکری مرحوم تھے اور مدمقابل ان کے دوسرے دوست اور ہمسایہ اور بلند پایہ شاعر حکیم سید علی آشفتہ تھے۔ حکیم آشفتہ کی غزل کے ایک یا دو اشعار پر مرزا محمد عسکری ادیب نے عروضی اور ادبی اعتراضات وارد کئے اور ان کے جوابات آشفتہ نے تحریر فرمائے۔ یہ دونوں مضامین 'الناظر' میں شائع ہوتے تھے لیکن بحث نے طول پکڑا اور دونوں جانب حمایتی ٹولیاں صف آرا ہو گئیں۔ مرزا محمد عسکری ادیب کی تائید میں اثر مرحوم، صفی مرحوم، شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ وغیرہم نے بہت اچھے اور فاضلانہ مقالے لکھے۔ ان کے جواب میں اس زمانے کے نوجوان شاعروں میں قریب قریب سب ہی نے بلند پایہ اور مہذب خامہ فرسائی کی تھی۔ یہ بحث تقریباً دو برس تک ۲۵۔ ۱۹۲۴ء میں چلی تھی۔ ہر اعتراض بلند پایہ اور ہر جواب شستہ اور شائستہ ہوتا تھا۔ یہ معرکہ ادبی مذاکروں پر مشتمل تھا اور اس سلسلہ میں ہر مضمون جو 'الناظر' میں شائع ہوا تھا، کارآمد اور گرانقدر تھا۔

آخر الذکر ہفتہ وار 'سچ' اس زمانے میں جاری ہوا تھا جب لکھنؤ کا قدیم معاشرہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ انگریزوں کا تسلط پوری طرح ہو چکا تھا اور ہندوستانیوں میں آزادی کا رجحان جنم لے رہا تھا، پہلی جنگ عظیم نے خفتہ قوم کو بیدار کر دیا تھا اور وطن پرستی کی امنگ کروٹیں بدل رہی تھی۔ انحطاط و زوال کے دور میں اخلاق کا پست ہو جانا فطری بات تھی اور لکھنؤ والے درس اخلاقیات کے محتاج ہو رہے تھے۔ ان حالات میں مولانا عبد الماجد دریا آبادی آگے بڑھے اور ۱۹۲۵ء میں ہفتہ وار 'سچ' کا اجراء ہو گیا لیکن ابتدا میں اس کے ایڈیٹر مولانا ظفر الملک تھے اور شریک ادارت مولانا عبد الماجد دریا آبادی اور مولانا عبد الرحمن ندوی ہوا کرتے تھے۔ پھر بھی یہ بات کہنے میں آتی ہے کہ

> 'الناظر' کا ثقافتی معیار بہت بلند تھا۔ کج بحثی یا ذاتیات تو درکنار، سطحی اور پست درجہ کے مضامین کو بھی اس کے صفحات میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ مولانا ظفر الملک مناقشات سے خواہ وہ ادبی ہی کیوں نہ ہو، خود بھی دور رہنے کے قائل تھے لیکن ایک وقت ایسا آ گیا تھا جب وہ اس احتیاط کو برقرار نہیں رکھ سکے تھے اور ان کا ماہنامہ انہیں کے دو دوستوں کے درمیان ایک ادبی معرکہ کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔
>
> ایک طرف ان کے مخلص دوست اور مایۂ ناز ادیب مرزا محمد عسکری مرحوم تھے اور مدمقابل ان کے دوسرے دوست اور ہمسایہ اور بلند پایہ شاعر حکیم سید علی آشفتہ تھے۔

پہلے صفحہ پر 'سچی باتیں' کے عنوان سے مولانا عبد الماجد ایسے نوٹ لکھ دیا کرتے تھے جو بہت مقبول تھے۔ اردو کے متعدد اخبار و جرائد انہیں اسی عنوان کے تحت نقل کیا کرتے تھے اور چونکہ ہر نوٹ کے نیچے 'م' درج ہوتا تھا اس لئے ہر پڑھنے والا سمجھ لیتا تھا کہ قلم کاری مولانا عبد الماجد کی تھی۔ کچھ ہی مدت کے بعد 'سچ' کی تمام و کمال ادارت مولانا عبد الماجد کے حوالے ہو گئی تھی اور مولانا ظفر الملک محض ناشر و مہتمم رہ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انہیں تحریروں میں جو صفحہ اول پر شائع ہوتی تھیں، سیاسی رنگ بھی چھانے لگا تھا۔ بعض صفحات میں اسلام کے خلاف حملوں کا جواب ہوتا اور مغربی تہذیب کے مضر تناک اثرات سے بچنے کی مسلمانوں کو تلقین بھی دی جاتی تھی۔ 'سچی باتیں' کچھ اس انداز سے لکھی جاتی تھیں کہ پڑھنے والوں پر گہرا اثر پڑتا تھا اور سیاسی تبصروں میں اتنی چستی اور صفائی ہوتی تھی کہ حکومت وقت کے لئے یہ ہفتہ وار ناقابل برداشت ہو گیا تھا چنانچہ ضمانت طلب ہوئی جو داخل نہ ہو سکی اور اخبار بند ہو گیا۔ کچھ مدت کے بعد پھر جاری ہوا لیکن ۱۹۳۳ء میں بالکل بند کر دیا گیا۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے بعد والے حالات ہمارے موضوع سے خارج ہیں لیکن سچ کی بات اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی یاد آ جانے کے بعد اس تذکرہ کو اسی مقام پر ختم کر دینے کو دل گوارا نہیں کرتا کیونکہ 'سچ' کے بالکل بند ہو جانے کے بعد مولانا دریا آبادی کے دل و دماغ میں ان کے حوصلے بلند سے بلند تر ہو گئے تھے۔ وہ ایک جلیل القدر عالم و ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ملک کی جنگ آزادی میں ایک گرانقدر مجاہد کی حیثیت سے بھی برابر نبرد آزما رہے تھے۔ ان کے پہلو میں حساس دل تھا اور ان کی ہمتیں پہاڑوں کی طرح استوار تھیں۔ عوام کی صحت مند رہنمائی اور مسلمانوں کے حالات کی اصلاح کے لئے ان کے دل کی تڑپ سچ کے بند ہو جانے پر صبر و شکر نہیں کر سکتی تھی

چنانچہ دو برس کے بعد انہیں کے منشاء پر اور انہیں کے ایک عزیز شاگرد عبدالرووٗف عباسی کے زیر اہتمام وہی سچ 'صدق' کے نام سے جاری ہوا۔ مولانائے محترم بدستور ایڈیٹر رہے۔ صدق میں بھی سچی باتیں کے عنوان سے مولانائے موصوف کے لکھے ہوئے شذرات نکلتے تھے جن کو مختلف اخبارات و جرائد نقل کرتے اور اخبار بیں طبقہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا تھا۔ سچ کے مقابلے میں صدق کی مدتِ حیات طویل تھی۔

متذکرہ بالا صحائف و جرائد ہفتہ وار یا ماہانہ ادبی کارنامے تھے۔ ان میں سیاسیات کی جھلک بھی آجاتی تھی لیکن ایسی نہیں ہوتی تھی کہ ہم ان میں سے کسی کو بھی سیاسی اخبار کہہ سکیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس زمانے میں کوئی خالص سیاسی اخبار مضبوط بنیادوں پر قائم ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ حکومت وقت سے لوگ خائف رہتے، حکومت کی معمولی نکتہ چینی کو بھی بغاوت پر محمول کرتے اور سیاسیات کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتے اور اپنے کان بند کر لیتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں دلی جذبات کا مظاہرہ ہوا۔ جرمنی کی فتح سے متعلق معمولی سے معمولی خبر پر خوشی کے مارے چہرے سرخ ہو جاتے تھے اور دلوں میں برطانیہ کی شکست کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ تحریک خلافت میں ایک حلقہ میں ان پوشیدہ جذبات کو ابھرنے کا موقع دیا۔ اب دوسری طرف شبیر حسن قتیل کے اخبار 'سیارہ' نے زبانوں کی لکنت کو بڑی حد تک صاف کر دیا تھا۔ فرنگی محل کے مولانا عبدالباری مرحوم نے مسلمانوں کی بڑی حد تک رہنمائی کی اور ان میں وطن پرورانہ جذبات اجاگر کرائے۔ اسی طرح صحت مند رجحانات منتشر افراد اور ٹولیوں میں ضرور پیدا ہوئے مگر کوئی منظم پارٹی یا جماعت ایسی نہ تھی جو ہندوستانیوں میں قومیت کا طوفان برپا کرا دیتی اور خالص وطن پرورانہ دھارے پر ان کو بہا دیتی۔ ہوم رول کے نام پر ہندوستانیوں میں سیاسی تحریک چلائی جارہی تھی لیکن اس کی قیادت آرام کرسی والے قائدین کے ہاتھوں میں تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں معرض وجود میں تھیں۔ سیاسی تحریکات بھی شروع کی جاچکی تھیں لیکن عوام کی پوری طرح تائید حاصل نہیں تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں ایک سمجھوتہ بھی ہو چکا تھا لیکن مسلم عوام پھر بھی ان تمام کارروائیوں سے بیگانہ تھے۔ ان حالات میں ایک اچھے اردو روزنامے کی شدید ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں مہاراجہ سر محمد علی خاں والی محمود آباد نے روزنامہ 'ہمدم' جاری کرایا جس کی ادارت کے لئے سید جالب دہلوی کو منتخب کیا گیا۔ مہاراجہ مرحوم کی ذات گرامی سے ملک وقوم کو بڑے بڑے فیض پہنچے تھے۔ وہ پکے نیشنلسٹ مسلمان تھے لیکن مسلمانوں کے ملی مفادات کا تحفظ بھی ان کے نزدیک ضروری تھا۔ اس وقت 'ہمدم' اخبار کو جاری کر کے انہوں نے ایک اہم سیاسی خدمات انجام دی تھی اور اس کو اپنی ہی ملکیت قرار دے کر بڑی ہوش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اسی طرح اس اخبار کی ادارت کے لئے سید جالب مرحوم سے بہتر اور کوئی دوسرا صحافی نہ منتخب کیا جاسکتا تھا اور نہ کسی دوسرے کو منتخب کرنا دانش مندی کا تقاضا تھا۔

روزنامہ 'ہمدم' کی سیاسی پالیسی اور اس کی سیاسی افادیت پر اظہار خیال کرنا ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے۔ متذکرہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا گیا اس میں بھی ہم حق بجانب نہیں تھے لیکن سید جالب کی شخصیت اور ان کے کردار کو پیش کر دینا ہمارا فرض ہے اور اس تذکرہ میں اس کی ضرورت ہے۔

سید جالب دہلوی بیحد مہذب اور شائستہ بزرگ تھے بلند پایہ ادیب اور گرانقدر صحافی تھے، بات کرنے کا خصوصیت کے ساتھ بہت اچھا سلیقہ تھا۔ شیخ ممتاز حسین عثمانی ایڈیٹر اودھ پنچ سے ان کے مذاکرے بہت دلچسپ ہوتے تھے۔ دونوں طرف سے طنز و مزاح کا سلسلہ شروع ہوتا تو ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یوں تو اعلیٰ درجہ کا صحافی ہوتے ہوئے ان کا حافظہ بہت قوی تھا لیکن مرزا محمد ہادی رسوا کی طرح کبھی کبھی ان کی یادداشت اتنا شدید دھوکا دیتی تھی کہ حاضرین دنگ رہ جاتے تھے۔ مرزا سودا کا یہ واقعہ میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ وہ ایک مرتبہ خود فراموشی میں یہ بھی بھول گئے تھے کہ 'امراؤ جان ادا' خود انہیں کا لکھا ہوا ناول تھا۔

اسی طرح سید جالب کے بھول جانے کا یہ واقعہ اس سے زیادہ حیرت خیز ہے، مرزا محمد عسکری ادیبؔ کے یہاں ایک بار ماہ رمضان میں افطار صوم کی ضیافت تھی جس میں مولانا ظفر الملک، مولانا عبدالحلیم شرر، خان بہادر سید احمد حسین رضوی اور بعض دوسرے جلیل القدر حضرات مدعو تھے۔ میں بھی عزیزدارانہ تعلقات کی بنا پر مرزا صاحب کے یہاں ہر موقع پر شریک رہا کرتا تھا۔ افطار صوم کا وقت آیا تو نماز باجماعت ہونا بھی ضروری تھا۔ سن وسال کی بزرگی کی بنا پر قرار پایا کہ سید جالب نماز پڑھائیں اور وہ راضی بھی ہو گئے۔ پہلی رکعت میں سورۂ الحمد کے بعد جب دوسری سورت شروع کی تو چند آیتوں کے بعد آگے نہ بڑھ سکے۔ تکبیر کہہ کر رکوع اور سجود بجالائے یہاں تک تو غنیمت تھا کہ نماز باطل نہیں ہوئی تھی لیکن دوسری رکعت میں سورۂ الحمد کی تیسری یا چوتھی آیت پر اٹک گئے اور ایسا اٹکے کہ کسی طرح آگے کی آیت یاد نہ آئی۔ لاحول کہہ کر اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور کسی دوسرے سے فوراً اقتدا کی۔ یہ واقعہ میرا چشم دید ہی نہیں بلکہ نمازیوں میں ایک صف میں خود میں بھی شریک تھا۔ اس مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ اس زمانہ میں تہذیب و شائستگی کا یہ عالم تھا کہ جالب مرحوم کی اس غلطی پر کسی صف میں کوئی کھلبلی نہیں نمایاں ہوئی اور نہ کسی نے ان کی بزرگی اور عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی نکتہ چینی کی بلکہ اس ناسزا وار حرکت کو ان کی ضعیفی اور کبرسنی پر محمول کر کے نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ خود معصومانہ انداز میں خاموش ہو گئے تھے۔

❑❑❑

دعوت عداوت

س۔ر۔ یاتری
ایف۔ای۔۷، کوی نگر، غازی آباد
موبائل: 9806045357

چاہیں تو آپ اسے میری سنک بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے اچھی خاصی ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد پریکٹس کے لئے ایک غیر معروف سا قصبہ چنا۔ قصبہ بھی کیا تھا، تین بٹا چار تو وہ گنوئی دیہات جیسا ہی بچھڑا ہوا تھا۔

جو دیہاتی اپنے مریضوں کو بیل گاڑیوں میں لے کر آتے تھے۔ ان کی مالی حالت کا ذکر تو بے معنی ہے۔ بس! یہ سمجھئے کہ بطور فیس جو روپیہ دو روپیہ دے کر جاتے تھے، اسے لے کر بھی اتنی حجت کرتے کہ سر بھنا اٹھتا۔ بعض اوقات تو انہیں دی گئی دوا کے پیسے بھی ہاتھ نہیں لگتے تھے۔ جب میں باہر بھیڑ سے تنگ ہو کر بھاگ کھڑے ہونے کا رستہ ڈھونڈھ رہا تھا تو میری پتنی نے مجھے سجھاؤ دیا کہ ایسا حساب بتاؤ کہ دوا میں خرچ ہو ایک روپیہ تو ایک آنہ بچ جائے۔ اس کی بات پر میں نے غور کیا اور سختی سے یہ طے کیا کہ آگے سے یہی کروں گا۔ ایک تو میرے پاس کوئی کمپاؤڈر نہیں تھا۔ دوسری بہتر بات یہ تھی کہ میرے پاس مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ گویا روپیہ پیچھے ایک آنہ بچانے کی پوری گنجائش تھی۔

گنی چنی آمدنی کے بوتے پر میں نے دیہات کے بڑھئی سے اپنی کلینک میں مریضوں کے بیٹھنے کے لئے دو سیدھی سادی بنچیں بنوالی تھیں۔ ایک میز کرسی میں نزدیک کے بڑے قصبے کے اتواری بازار سے خرید لایا تھا۔

جہاں تک میرے اپنے گھر کا سوال ہے، وہاں فرنیچر جیسا کچھ نہ تھا۔ بان سے بنی ہوئی دو چارپائیاں اور ایک چٹائی تھی جس پر میں پتنی اور بچے بیٹھ کر کھانا پینا کر لیتے تھے۔ میرا بیٹا سات سال کا ہوگا وہ رات کو کبھی میرے ساتھ اور کبھی اپنی ماں کے ساتھ سو جایا کرتا تھا۔

یہی بات برتن وغیرہ کو لے کر تھی۔ پیتل کی دو پتیلیاں تھیں۔ گلاس وغیرہ بھی پیتل کے مرادآبادی قلعی دار تھے۔ پلیٹوں کی جگہ تام چینی کی کچھ رکابیاں تھیں۔ اتنے مختصر سامان سے ہی گھر گرستی کی گاڑی کسی طرح چل رہی تھی۔ میرے دواخانے پر ابھی تک تو اکثر گاؤں دیہات کے مریض آتے تھے پر اب ان کی دیکھا دیکھی قصبہ کے غریب غربا بھی آنے لگے تھے۔ رات میں کبھی مجھے اپنا مریض دکھانے کے لئے ساتھ لے جاتے تو تھوڑی بہت فیس بھی دے دیتے تھے۔

اسی قصبے کے دو پریوار ایسے تھے جن کے یہاں سے فیس تو بغیر حجت کے ملتی تھی۔ کبھی کبھی موسمی پھل بھی تحفے میں مل جاتے تھے۔ ان دونوں دوستوں میں ایک نواب شبیر احمد اور دوسرے راؤ ویریندر ورما تھے۔ دونوں اچھے کھاتے پیتے متمول گھرانے کے لوگ تھے۔ کتنے ہی ایکڑ میں پھیلے ہوئے تھے ان کے فارم، ان کے پریوار کے لوگ شہروں میں رہتے تھے پر کبھی کبھار ان میں سے کچھ کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔

نواب صاحب اور راؤ صاحب کی خوب لمبی چوڑی حویلیاں تھیں۔ کاشت کی زمین اور پھل دار درختوں کے باغات تھے۔ نواب صاحب تو اکثر زمین جائداد کے مقدموں کی وجہ سے شہر کی کورٹ کچہریوں میں مصروف رہتے تھے اور راؤ صاحب اکثر قصبے میں ہی رہتے تھے۔ ان کے جوان بیٹے زمین جائداد سے جڑے معاملات خود ہی دیکھتے، سنبھالتے رہتے تھے۔ چونکہ راؤ صاحب کا زیادہ وقت خالی ہی رہتا تھا اس لئے وہ میرے دواخانے پر آ بیٹھتے تھے۔ مریضوں سے نپٹ کر میں بھی دیر تک گپ شپ میں لگا رہتا تھا۔ انہوں نے کئی بار مجھے کھانے پر بھی مدعو کیا تھا اور آم کی فصل پر آموں کا ٹوکرا بھی برابر مجھے بھجواتے تھے۔ اس طرح ان سے میل جول کافی بڑھ گیا تھا۔

ایک شام میں اور راؤ صاحب کلینک پر بیٹھے گپیں مار رہے تھے کہ وہ باتوں باتوں میں اچانک کہہ بیٹھے:

> ہندی ادب کی معتبر اور بزرگ شخصیت س۔ر۔ یاتری گزشتہ تقریباً ۳۵ برسوں سے مسلسل ناول اور افسانے لکھ رہے ہیں۔ ۱۹۷۹ میں ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'دھراتل' شائع ہوا۔ اس کے بعد پانچ مزید مجموعے اور ناول شائع ہوئے۔ اتر پردیش ہندی سنستھان کے علاوہ دیگر ہندی اداروں کے کئی انعامات سے انہیں نوازا جاچکا ہے۔ اب تک ان کے تقریباً ڈیڑھ سو کہانیاں اور ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔
>
> ادبی محفل آرائیوں کے لئے مشہور ترقی پسند رجحان لیکن مختلف نظریات کی قدر کرنے والے س۔ر۔ یاتری کی مشہور کہانی دعوت عداوت کا اردو ترجمہ امروہہ کے 'شکیل جاوید' نے کیا ہے۔
>
> (ایڈیٹر)

"ڈاکٹر صاحب! تم کچھ بھی کہو لیکن ہو تم بھی مہا کنجوس۔ کبھی بھول کر بھی بھابی صاحبہ کے ہاتھوں بنی رسوئی چکھنے کا نیوتہ نہیں دیا؟"

ساتھ ہی راؤ صاحب اپنی باغ و بہار شخصیت کے مطابق قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

بھلے ہی طنز و مزاح کے انداز میں کہا گیا تھا مگر اس میں سو فیصدی سچائی تھی۔ میں متعدد بار ان کی حویلی پر جا چکا تھا اور وہاں ہر بار میری اچھی تواضع ہوئی تھی لیکن اس وقت ان کا مزاح کے انداز میں کہا گیا طنز سن کر میرے گھر کی ادنیٰ حیثیت میری آنکھوں میں گھوم گئی پر راؤ صاحب کی بات کا جواب تو دینا ہی تھا۔ گہری دھند میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے میں نے جواب دیا:

"آپ تو جانتے ہی ہیں راؤ صاحب! کہ میرے یہاں مریضوں کی کتنی بھیڑ رہتی ہے۔ گویا ناک میں دم رہتا ہے البتہ اتوار کی شام میں میں کلینک نہیں کھولتا۔ اگلے اتوار کو آپ ہمارے یہاں بھوجن کریں گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

"یار نرے احمق ہو! معمولی سا مذاق بھی نہیں سمجھتے؟ چھیڑ چھاڑ میں کہی گئی بات کو جی پر اتنی سنجیدگی سے لیتے ہو! میں کیا تمہاری مصروفیت نہیں جانتا ہوں، کھانے والے کا چکر چھوڑو۔ کسی دن گھومتا گھامتا چلا آؤں گا۔"

میں نے ان کی بات کو درگزر کرتے ہوئے کہا:

"نہیں! اگلے اتوار کی دوپہر آپ کو کھانے پر آنا ہی ہوگا۔ ٹال مٹول ہرگز نہیں چلے گی۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولے:

"چلو! تو پھر آ ہی جاؤں گا جب اتنا اصرار کرتے ہو۔ پر ایک بات یاد رکھنا، تام جھام بالکل مت کرنا بس! سیدھے سے دال بھات اور پھلکا بنوانا یا کوئی سبزی وغیرہ۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور ان کے ساتھ کلینک سے باہر نکل گیا۔

گھر لوٹنے پر میں نے پتنی سے اگلے اتوار کو راؤ صاحب کے کھانے پر آنے کی بات کہی تو وہ سن رہ گئی۔ گہری فکر میں ڈوب کر بولی:

"انہیں نیوتہ دیتے وقت ایک بار بھی یہ نہ سوچا کہ کھلاؤ گے کہاں بٹھا کر؟ گھر میں نہ میز کرسی ہے نہ ڈھنگ کے برتن بھانڈے۔!"

اس کی بات سن کر میں فکرمند ہو گیا اور سر کھجاتے ہوئے بولا:

"ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس وقت تو یہ بات میرے دماغ میں آئی ہی نہیں تھی۔"

بھلے ہی طنز و مزاح کے انداز میں کہا گیا تھا مگر اس میں سو فیصدی سچائی تھی۔ میں متعدد بار ان کی حویلی پر جا چکا تھا اور وہاں ہر بار میری اچھی تواضع ہوئی تھی لیکن اس وقت ان کا مزاح کے انداز میں کہا گیا طنز سن کر میرے گھر کی ادنیٰ حیثیت میری آنکھوں میں گھوم گئی پر راؤ صاحب کی بات کا جواب تو دینا ہی تھا۔ گہری دھند میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے میں نے جواب دیا:

"آپ تو جانتے ہی ہیں راؤ صاحب! کہ میرے یہاں مریضوں کی کتنی بھیڑ رہتی ہے۔ گویا ناک میں دم رہتا ہے البتہ اتوار کی شام میں میں کلینک نہیں کھولتا۔ اگلے اتوار کو آپ ہمارے یہاں بھوجن کریں گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

"دیکھ لو راؤ جی کو چٹائی پر بٹھا کر کھلانا ہی پڑے گا؟"

میں نے کہا: "چٹائی پر بٹھا کر کھلانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کراکری وغیرہ نہ ہوگی تو کھانا کس چیز پر پروسا جائے گا۔ کم از کم تام چینی کی پلیٹوں میں تو انہیں کھلا نہیں سکتے؟"

کافی غور و خوض کے بعد حل یہ نکلا کہ نواب شبیر احمد کے یہاں سے ضروری کراکری لائی جاسکتی ہے۔ وہ نہایت شریف انسان ہیں، انکار کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔

آخر ہفتے کی شب میں اپنے بیٹے نریش کے سو جانے پر میں خود نواب صاحب کی حویلی پر پہنچا۔ اس وقت نواب صاحب تشریف نہیں رکھتے تھے۔ کسی کام سے شہر گئے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی عدم موجودگی میں بھی مجھے اپنی ضرورت کی کراکری مل گئی۔ کراکری حاصل کرنے کے بعد مجھے ایک عجیب سا سکون ملا۔

اگلی صبح ہی سے پتنی نے بڑے سلیقہ کے ساتھ دعوت کی تیاری شروع کر دی۔

اتوار کی دوپہر کو راؤ صاحب کے انتظار کے بعد آخر میں نے کلینک بند کیا، گھڑی پر نظر ڈالی جو پورا ایک بجا رہی تھی جیسے ہی کلینک سے نیچے اترا تو سامنے راؤ صاحب کو آتے دیکھا۔ میں انہیں ساتھ لے کر گھر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا!

پتنی نے جم کر دھلائی پچھائی کی تھی۔ زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے راؤ صاحب کو وہیں بیٹھنے کو کہا۔ انہیں وہاں بٹھا کر رسوئی میں چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر راؤ صاحب کی آمد کی اطلاع سن کر پتنی مسکرائی۔ جانے کیوں ایسا لگا جیسے وہ کسی پریکشا سے گزرنے والی ہے۔ اس نے رسوئی کی جالی سے راؤ صاحب کو جھانکا۔

رسوئی سے نکلا تو میں نے دیکھا راؤ صاحب نریش سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ چند ہی لمحوں میں نریش راؤ صاحب سے گھل مل گیا ہے۔ راؤ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی پھبتی کسی: "لگتا ہے رسوئی میں پکوانوں کی مہک لینے گئے تھے، ڈاکٹر صاحب!"

"جی ہاں، یہی سمجھیے مگر اب دیر نہیں ہے۔ آپ مہک بھی لیں گے اور بھوگ بھی لگا سکیں گے۔ بس! تھوڑی مہلت اور دیجیے۔"

"ڈاکٹر صاحب! ایسی کوئی جلدی نہیں، اب آئے ہیں تو کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ ویسے ہم صبح کو

ناشتہ تگڑا لیتے ہیں۔''

میں نریش سے مخاطب ہوکر کہنے لگا:

''جاؤ! تھوڑی دیر باہر جا کر کھیلو، ابھی کھانا بن رہا ہے۔''

''ارے دوپہر میں بچے کو کہاں بھیجتے ہو، دھوپ تیز ہے اور پھر یہ بھی کوئی کھیلنے کا وقت ہے؟''

مگر نریش تو گھر سے ہر وقت باہر جانے کو تیار ہی رہتا تھا۔ راؤ صاحب کے روکنے کے باوجود وہ ایک لمحہ میں پھر سے اڑ گیا۔

چند ہی لمحوں میں ہنسی خوشی کی بات چیت کے درمیان پلیٹیں سجا دی گئیں اور کھانے کی ڈشیں قرینے سے دسترخوان پر سجا دی گئیں۔

جب پلیٹوں میں کھانا پروسا جا رہا تھا تو راؤ صاحب نے پوچھا: ''نریش کہاں ہے؟''

اس بار پتنی نے جواب دیا: ''کہیں بچوں کے ساتھ باہر کھیل رہا ہوگا۔''

''ارے واہ! یہ بھی کیا بات کہی آپ نے؟ کیا تین چار لوگ بھی ایک ساتھ کھانے نہیں بیٹھ سکتے؟''

راؤ صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے:

''ڈاکٹر صاحب! بچے کو بھی بلا لیجئے۔''

راؤ صاحب کی فرمائش پر میں نے نریش کو باہر سے بلا لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں دھوئے اور اسے دسترخوان پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ یہاں کھانے میں دال چاول، پوری کچوری، پھلکے، سبزی، سلاد وغیرہ موجود تھے اور قلمی آم کی قاشیں دیکھ کر کسی کی بھی بھوک چمک اٹھتی۔ نریش تو پھر بھی بچہ تھا اور اصلیت بھی یہی تھی کہ ایسے پکوان بھلا ہمیں روز کہاں کھانے کو مل سکتے تھے؟

اس وقت یکا یک نریش کی آنکھوں میں اجنبی پن ابھر آیا گویا یہ اس کا اپنا گھر نہ ہو اور وہ بھول سے کہیں اور آ گیا ہو۔ اس نے دسترخوان پر رکھی ہوئی چمکیلی پلیٹیں اور ڈشیں دیکھ کر پوچھا:

''یہ برتن کہاں سے آئے؟''

اسکے اس غیر متوقع سوال سے میں اور میری پتنی گھبرا گئے۔ میں نے اسکی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا:

''نریش بیٹا! دیکھو کتنی بڑھیا کھیر ہے! تمہاری ممی نے اسے خاص طور پر تمہارے اور راؤ صاحب کے لئے بنایا ہے۔''

پر اس کھیر اور دوسرے لذیذ کھانوں میں اس وقت شاید کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی اصل دلچسپی نئی نئی خوبصورت پلیٹوں، ڈش اور بڑے بڑے چمچوں، چاندی کی طرح چمکتی ہوئی چھوٹی بڑی پیالیوں پر تھیں۔ اس نے ایک بار پھر ایک اس سوال کو دہرایا۔

> پتنی نے جم کر دھلائی پچھائی کی تھی۔ زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے راؤ صاحب کو وہیں بیٹھنے کو کہا۔ انہیں وہاں بٹھا کر رسوئی میں چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر راؤ صاحب کی آمد کی اطلاع سن کر پتنی مسکرائی۔ جانے کیوں ایسا لگا جیسے وہ کسی پریکشا سے گزرنے والی ہے۔ اس نے رسوئی کی جالی سے راؤ صاحب کو جھانکا۔
>
> رسوئی سے نکلا تو میں نے دیکھا راؤ صاحب نریش سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ چند ہی لمحوں میں نریش راؤ صاحب سے گھل مل گیا ہے۔ راؤ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی پھبتی کسی: ''لگتا ہے رسوئی میں پکوانوں کی مہک لینے گئے تھے، ڈاکٹر صاحب!''

''پاپا جی! یہ اتنے سندر برتن کہاں سے آئے؟''

اس بار راؤ صاحب ہنس کر بولے: ''تمہاری ممی نے الماری میں چھپا کر رکھے تھے، وہی سے نکالے ہیں۔''

''کون سی الماری سے نکالے ہیں؟''

یہ اور بڑی مصیبت تھی۔ کیونکہ گھر میں ڈھکی چھپی کوئی الماری نہیں تھی۔ نریش کے اس جان لیوا سوال نے گھر میں ایک عجیب سا ماحول بنا دیا۔ نریش کی ماں کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ نریش کے ذہن میں جیسے یہ برتن سانپ کی طرح کلبلا رہے تھے۔ اس نے اپنے سوال کو دوسرے رنگ میں پیش کیا:

''پاپا جی! ہمارے گھر میں الماری کہاں ہے؟''

اپنے طور پر میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میرا پارہ بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا اور پھر میرا سر چکرانے لگا۔ اب میری قوت برداشت کی زنجیریں جیسے کسی نے کھول دی تھیں۔ میں اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اپنے کٹکھنے لہجے میں بولا:

''الو کی دم! شیطان کی آنت! یہ کراکری یعنی برتن نواب صاحب کے گھر سے منگوائے ہیں۔ اب تو چین سے بیٹھ آفت کے پرکالے۔ تیرے جیسے کمبخت کے ہوتے ہوئے ہم ہر جگہ ننگے ہو کر ہی رہیں گے۔''

میرا یہ غصہ غیر ضروری اور ناحق تھا جس کی سارے ماحول پر منحوسیت پھیل گئی یا تو بچے کو پہلے ہی سمجھا دینا چاہئے تھا کہ مہمان کے سامنے ایسا کوئی سوال نہ کرے یا پھر یہ بتا دینا چاہئے تھا کہ یہ کراکری کہاں سے منگوائی ہے یا اسی وقت سچائی بتا دینا چاہئے تھی۔

راؤ صاحب میری اقتصادی حالت سے بخوبی واقف تھے اور اس غریبی میں بھی مجھے عزت دیتے تھے مگر میں نے جھوٹی شان دکھانے کے چکر میں سارا کھیل بگاڑ دیا۔

میری بک بک کا جیسے نریش پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ وہ بھوکا تھا اور دسترخوان پر رکھی ہوئی کھیر کی پیالوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے جھٹ سے کھیر کی پیالی کو اٹھا لیا اور بجائے چمچ کے انگلی سے ہی کھیر کھانی شروع کر دی۔ اس کی اس حرکت نے مجھے اور میری پتنی کو جیسے شرمندگی کے غار میں ڈھکیل دیا۔

راؤ صاحب سر جھکائے ہوئے من سے کھانا کھانے لگے۔ ہمارا کھانا کچھ اس انداز پر شروع ہوا گویا ہم کسی غم کے موقع پر محض رسم ادائیگی کی غرض سے منھ چلانے بیٹھے ہوں۔

□□□

غزل

ابتدا ہے، لازمی ہے لڑکھڑا جانا مجھے
آتے آتے آئیں گے آدابِ میخانہ مجھے

آپ تو نظریں ملا کر مسکرا کر چل دئے
کوئی مجنوں کہہ رہا ہے کوئی دیوانہ مجھے

مت لڑو شیخ و برہمن جیتے جی اس بات پر
موت پر میری جلانا ہے یا دفنانا مجھے

بعد میں میت اٹھانا پہلے بتلاؤ ذرا
اس قفس کے بعد آخر کس قفس جانا مجھے

اتنی پی ہے اتنی پی ہے اتنی پی ہے مئے کشو
شیخ بھی کہنے لگے ہیں پیر میخانہ مجھے

سوچتا ہوں اب زمیں پر کیوں بناؤں گھر وجےؔ
لوٹ کر اللہ کے ہے گھر جانا مجھے

وجئے تیواری وجےؔ
A/1، شری منو کامنیشور ہنومان مندر کیمپس، جواہر چوک، بھوپال
موبائل:9826041525

غزل

دریائے زندگی ہے ازل سے بہاؤ پر
اور اس میں ہم سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر

پہلی سی اب وہ رونقِ بازار بھی نہیں
دنیا کا کاروبار ہے اب چل چلاؤ پر

اک دوسرے کے درد کو محسوس کر سکیں
یہ بات منحصر ہے دلوں کے لگاؤ پر

زخم وفا نہاد کا بھرنا محال ہے
مرہم لگا رہے ہو مرے دل کے گھاؤ پر

سچ ہے کہ آخرت کا سفر ہے بہت طویل
سب اہل قبر جا کے رُکے ہیں پڑاؤ پر

جس کو نسیم صبح سے حاصل نہیں سکوں
کیسے وہ رات کاٹے گا غم کے الاؤ پر

اظہرؔ سلیم عشق کا انجام جو بھی ہو
ہم نے تو زندگی ہی لگا دی ہے داؤ پر

اظہرؔ سلیم
امام گنج، مئوناتھ بھنجن
موبائل: 9044123147

ایندھن

حمید دلوائی
۱۹۳۲ ۱۹۷۷

سیلاب کا موسم آیا اور واششٹھی ندی لبالب بھر گئی۔ تین چار دن لگاتار پانی چڑھتا رہا، پھر کنارے سے باہر نکل آیا۔ لوگ ہر روز جوار کے وقت پاٹ کے قریب کے کھیتوں میں جا گھسنے والا پانی روکنے کے لے دوڑ دھوپ کرتے۔

ایک دن لہریں بہت اونچی تھیں۔ پانی کناروں کے بند توڑ کر بہہ نکلا اور پوری قوت سے دھان کے کھیتوں میں پھیل گیا۔ بند پر کھڑے لوگ پناہ لینے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے بھاگنے لگے۔ وہ دور کھڑے بے بسی سے پانی کے منہ زور سیلاب کو دیکھتے رہ گئے۔ آدھی سے زیادہ کھیتی برباد کر کے پانی اترنا شروع ہوا۔

وَنے گاؤں کے مسلمانوں کو مچھلی پکڑنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ انہوں نے صبح سویرے کھاڑی میں مچھلیاں روکنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ انہوں نے ریتیلی زمین پر اپنے بانس گاڑ دئے اور ٹوکریاں نیچے دبا دیں۔ پانی چڑھنا شروع ہوتے ہی انہوں نے ٹوکریاں اوپر کھینچیں اور پچاس ساٹھ لوگوں کا ٹولہ بانسوں کو پکڑ پکڑ کر پانی میں غوطے مارنے لگا۔ انہوں نے خالی ہاتھوں سے بڑی بڑی مچھلیاں پکڑ کر پاس بندھی دو تین چھوٹی کشتیوں میں پھینکنی شروع کر دیں۔ دو ایک گھنٹوں میں کشتیاں مچھلیوں سے بھر گئیں۔ مچھلیوں کا ڈھیر دیکھنے کے لئے لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ وَنے گاؤں کے مسلمان ایک ایک مچھلی پونچھ سے پکڑ کر ان کی طرف پھینکتے ہوئے کہنے لگے۔ 'ٹوٹنے دو بند، مچھلی کھاؤ، روؤ مت۔'

ان لوگوں میں میرا بھائی بھی تھا۔ اسے ایک بڑی سی کومٹا مچھلی ہاتھ لگی۔ ٹوٹے ہوئے بند کا غم بھول کر وہ کومٹا لئے گھر کی طرف دوڑا۔ وہ مچھلی کو پونچھ سے پکڑ کر لہراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ مچھلی ابھی زندہ تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ بڑی سی پرات میں سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کا تڑپنا بند ہو گیا۔ اس کی ساکت کھال پر لگے ہوئے بڑے بڑے سفنے چمکنے لگے۔ ہم سب اس پرات کے گرد جمع ہو گئے۔ بابا نے کہا۔ ''اچھا ہوا تم بھی آئے ہوئے ہو۔ مچھلی کھانے کا شوق پورا ہو جائے گا۔'' اور وہ پھر جا کر اپنے تکئے پر براجمان ہو گئے۔ بھائی پھر کھیت کی طرف لوٹ گیا۔ بھابی اور میں مچھلی کے پاس رہ گئے اور بھابی مجھ سے پوچھنے لگی، 'اتنی بڑی مچھلی کا کیا بناؤں؟ تلوں، شوربہ بناؤں یا ہلدی والا سالن پکاؤں؟'

'جو جی چاہے بناؤ۔' میں نے کہا، 'بس کھانے کا کام میرا ہے۔'

وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ مچھلی کو کس طرح پکائے۔ پھر بھی وہ اسے صاف کرنے بیٹھ گئے۔ سفنے اکھاڑنے لگی۔ اس میں اس کے ہاتھ میں پکڑی چھری سے اڑتے ہوئے ہر شکل کے سفنوں کو بیٹھا تکتا رہا۔

ٹھیک اسی لمحے برہمن کی بیٹی سمتی نے پچھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ شہری رکھ رکھاؤ سے واقف اس لڑکی نے دروازے پر انگلیوں سے کھٹکھٹاتے ہوئے پوچھا، 'کیا میں اندر آسکتی ہوں؟' اس پر میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا

حامد عمر دلوائی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابوں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوائی کے ناول 'ایندھن' کی دوسری قسط شائع کی جا رہی ہے۔

(ایڈیٹر)

کہ اس نے یہ سوال کس سے کیا ہے۔ اس کے اچانک آنے پر مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اسے کبھی پہلے مسلمانوں کے گھر میں آتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس سے پہل کہ بھابی اپنے کام سے سر اٹھاتی، میں نے ہنس کر کہا، 'آؤ، آجاؤ نا!'

سمتی مسکراتے ہوئے اندر آ گئی اور باورچی خانے کی دہلیز پر آ کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر مچھلی کی چیر پھاڑ کو دیکھتی رہی، پھر میری طرف مڑ کر کہنے لگی:

'کیوں، تم کب آئے؟'

میں اس کے اس بے تکلفی سے پکارنے پر حیران رہ گیا۔ وہ میرے برابر کی نہیں تھی۔ ہم دونوں میں عمر کا فرق تو تھا ہی، ایسے بے تکلفی کے تعلقات بھی نہیں تھے۔ جب میں بمبئی گیا تب وہ بہت چھوٹی تھی۔ گھاگھرا پہنتی تھی۔ وہی سمتی اب اتنی بڑی ہوگئی تھی۔ اپنی اس بے تکلفی، بلکہ قربت بھر زبان کو چھوڑ کر وہ مجھ سے ادب سے پیش آ رہی تھی۔ باورچی خانے کے دروازے سے ٹیک لگا کر تمیز سے کھڑی تھی۔ میں نے کہا:

'بہت سے ہوگئے۔'

'بہت دن یعنی کتنے؟' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

'دو تین ہفتے ہوگئے۔'

'پھر اتنے دنوں میں کہیں دکھائی نہیں دئے؟'

'میں کہیں باہر نہیں جاتا۔'

'سنو، یہ بیمار ہیں، اس لئے آئے ہیں۔' بھابی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولی۔

'تم بیمار تھے؟'

'بیمار ہوں۔'

'اچھا، اچھا ٹھیک ہے لیکن ہوا کیا ہے؟ بیمار دکھائی نہیں دیتے، اس لئے پوچھ رہی ہوں۔'

'ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔'

'کب؟'

'کافی دن پہلے، آرام کرنے آیا ہوں۔'

'آرام کرنے کے لئے گاؤں کی یاد آئی، ہے نا؟'

'اور کہاں جاتا۔ ان سب نے بہت اصرار کیا تھا۔'

'ہوں!' کی آواز نکال کر وہ کچھ دیر چپ رہی۔ اسی دوران بھابی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دہلیز پر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی۔ اٹھی ہوئی ساڑی کو کھینچ کر گھٹنے سے نیچے کیا، پھر بظاہر بے پروائی سے سوال کیا:

'کسی کے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اخبار پڑھتی ہوں اور تمہارا بھائی بھی ذکر کرتا رہتا ہے۔ کہاں گئے ہیں تمہارے شوہر؟' اس نے بھابی کی طرف مڑ کے سوال کیا۔

'مجھے کیا پتا' بھابی نے جواب دیا۔

پھر وہ بھابی سے باتیں کرنے لگی۔ بھابی نے مچھلی کاٹنے کا کام روک دیا تھا اور چائے بنانے لگی تھی۔ انہی سنے ہوئے ہاتھوں سے اس نے چائے بنائی، مجھے دی اور ایک پیالی اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے کی پیالی سے مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ میں نے ایک گھونٹ لے کر کہا:

'بھابی! سمتی کو دوسری پیالی دو، اسے مچھلی کی بو آ رہی ہوگی۔'

'تمہاری سیاست کیسی چل رہی ہے؟ سنا ہے تم وہاں بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو' اس کے لہجہ میں مذاق کا تاثر تھا۔

'کس نے بتایا؟' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

'کسی کے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اخبار پڑھتی ہوں اور تمہارا بھائی بھی ذکر کرتا رہتا ہے۔ کہاں گئے ہیں تمہارے شوہر؟' اس نے بھابی کی طرف مڑ کے سوال کیا۔

'مجھے کیا پتا' بھابی نے جواب دیا۔

پھر وہ بھابی سے باتیں کرنے لگی۔ بھابی نے مچھلی کاٹنے کا کام روک دیا تھا اور چائے بنانے لگی تھی۔ انہی سنے ہوئے ہاتھوں سے اس نے چائے بنائی، مجھے دی اور ایک پیالی اس کے سامنے رکھ دی۔ چائے کی پیالی سے مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ میں نے ایک گھونٹ لے کر کہا:

'بھابی! سمتی کو دوسری پیالی دو، اسے مچھلی کی بو آ رہی ہوگی۔'

لیکن اس نے پیالی منھ سے لگا لی تھی۔ 'کوئی بو نہیں آ رہی.....' اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے لگا کہ اسے مچھلی کی بو پسند آ رہی ہوگی جیسے وہ چائے نہیں پی رہی تھی، اس پیالی میں بسی ہوئی مچھلی کی بو سونگھ رہی تھی۔ چائے پی کر اس نے پیالی آہستہ سے نیچے رکھ دی اور جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے مجھ سے کہنے لگی:

'ایک دن گھر آؤ نا!'

'آؤں گا کسی دن۔'

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر نکل گئی اور میں نے بھابی سے پوچھا، براہمن لوگ پہلے تو گھر میں نہیں آتے تھے اور نہ ہمیں اپنے گھر میں آنے دیتے تھے مگر دنیا اب کیسی بدل گئی ہے۔

'دیکھ لو، یہ تو گوشت بھی کھاتی ہے۔'

'کیا کہہ رہی ہو؟'

مجھے حیرت سے صدمہ سا ہوا۔ میں اتنی بڑی بڑی تبدیلیوں کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

'ابھی تمہیں پتا ہی کیا ہے۔ چار دن یہاں رہ کر دیکھو پھر اور سمجھ میں آ جائے گا۔ تب تمہیں محسوس ہوگا کہ گاؤں کے لوگ تم سے آگے نکل گئے ہیں۔'

اس دن اس نے اور زیادہ نہیں کہا لیکن کچھ ہی

دنوں میں بھائی کے ساتھ سمتی کے سمبندھوں کی باتیں میرے کانوں تک پہنچنے لگیں۔ پہلے پہل میں نے ان باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا۔ مجھے ان پر یقین نہ آیا لیکن پھر بھی اپنی تسلی کرنے کے لئے میں نے ایک دن خود بھابی سے دریافت کیا۔

'جو کچھ تم نے سنا ہے، وہ سچ ہے۔' وہ سرد لہجے میں بولی۔

میں کچھ دیر کے لئے بالکل چپ رہ گیا۔ بھائی کے دھنسے ہوئے گالوں والا چہرہ میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا۔ مجھے اس کے برتاؤ پر ترس آنے لگا اور سمتی پر تعجب ہونے لگا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ اس دن وہ بھائی سے ہی ملنے آئی تھی۔ اس نے بڑے سہج انداز میں اس کے بارے میں بھابی سے سوال کیا تھا۔ اس کا لہجہ بالکل معصوم تھا۔ اس میں لگاؤ یا خواہش کا کوئی نشان مجھے معلوم نہیں ہوا تھا۔

'کیا وہ اکثر یہاں آتی ہے۔'

'ہاں، روز آتی ہے۔'

'کیا وہ سب کے گھروں میں جاتی ہے؟'

'نہیں صرف ہمارے ہاں آتی ہے۔'

'کوئی کچھ کہتا نہیں؟'

'کہتے کیوں نہیں؟ لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ لیکن ان کو کیا پروا!'

'اور تم بھی کچھ بولتی نہیں؟'

'میں کیا بولوں، تمہارے خیال میں یہ میری سنیں گے کیا؟'

'بھائی سے نہیں، اس سے۔'

'اس سے؟' وہ ہنس کر بولی۔ 'اس سے کچھ کہنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ یہ بیچاری کس طرح پھنس گئی، میری سمجھ میں نہیں آتا۔'

یہ کہہ کر اس نے بات ختم کر دی۔ اپنے کاموں میں لگ گئی۔

اس کے بعد سمتی دو تین بار ہمارے گھر آئی۔ ہر بار اتفاق سے میں گھر پر تھا۔ وہ پچھلے دروازے سے آتی اور پہلے دن کی طرح باورچی خانے کی دہلیز پر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی بھائی کو پوچھتی، کبھی بھابی سے اور مجھ سے بتیاتی رہتی۔ اگر بھابی نے چائے یا کچھ کھانے کو دیا تو بے تکلف کھانے لگتی، جس دھیرج سے چلتی تھی اسی طرح دھیرے دھیرے کھاتی تھی۔ اچانک بول پڑتی، اور بولتے ہوئے دھیمے دھیمے مسکراتی رہتی۔ اس کے جاتے ہی بھابی ہنس کر مجھ سے کہتی، 'دیکھا کیسی میٹھی باتیں کرتی ہے۔ کیا

اس کے بعد سمتی دو تین بار ہمارے گھر آئی۔ ہر بار اتفاق سے میں گھر پر تھا۔ وہ پچھلے دروازے سے آتی اور پہلے دن کی طرح باورچی خانے کی دہلیز پر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔ کبھی بھائی کو پوچھتی، کبھی بھابی سے اور مجھ سے بتیاتی رہتی۔ اگر بھابی نے چائے یا کچھ کھانے کو دیا تو بے تکلف کھانے لگتی، جس دھیرج سے چلتی تھی اسی طرح دھیرے دھیرے کھاتی تھی۔ اچانک بول پڑتی، اور بولتے ہوئے دھیمے دھیمے مسکراتی رہتی۔ اس کے جاتے ہی بھابی ہنس کر مجھ سے کہتی، 'دیکھا کیسی میٹھی باتیں کرتی ہے۔ کیا اس پر غصہ ہونا میرے لئے ممکن ہے؟'

اس پر غصہ ہونا میرے لئے ممکن ہے؟'

ایک دن اچانک مجھے اس کے گھر جانے کا موقع ملا۔

اس دن ہمارے کھیتوں میں گھاس کی کٹائی ہو رہی تھی۔ بھائی کو بازار میں کچھ کام تھا۔ میں بھی گھر بیٹھے اوب گیا تھا۔ میں نے اسے بازار بھیج دیا، کہا، میں کھیت میں جاتا ہوں اور آہستہ آہستہ چل پڑا۔ براہمن باڑی کی طرف سے کھیت کو جانے والے راستے پر چلنے لگا۔

براہمن واڑی اب زیادہ تر ویران دکھائی دیتی تھی۔ ہر شخص اپنے کنبے کو لے کر پونا یا بمبئی کی طرف چلا گیا تھا۔ ان کے کبھی صاف ستھرے، لپے ہوئے آنگن اب گھٹنوں تک جھاڑ جھنکاڑ سے بھر گئے تھے۔ کچھ گھر بند پڑے تھے اور کچھ اتنے پرانے ہو گئے تھے کہ لگتا تھا کسی بھی لمحے گر پڑیں گے۔ میں دبے پاؤں اس آنگن کو پار کرنے لگا۔ سوکھے پتوں پر اپنے قدموں کی چاپ سے خود مجھے ڈر لگنے لگا۔

سمتی اپنے گھر کے دروازے میں بیٹھی تھی۔ اس نے گھٹنے موڑ کر چہرہ ان پر ٹکا رکھا تھا اور آنگن میں پڑے ہوئے پتھروں کو جمع کر کے انہیں ایک ایک کر کے سوکھے پتوں پر پھینکتے ہوئے اس سے پیدا ہونے والی آواز سن رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں روک لیا اور دھیرے سے نیچے لائی۔ چہرہ گھٹنوں سے اوپر اٹھایا، کچھ دیر میری طرف اچمبھے سے دیکھتی رہی، پھر مسکرا کر مجھ سے بولی:

'کیوں، اس طرف کیسے آنا ہوا؟'

'گھاس کٹائی کے لئے جا رہا ہوں۔'

'آج تم کیسے؟'

'بھائی شہر گیا ہے، اس لئے۔'

'جانا ضروری ہے کیا؟'

'یہاں تک آ گیا ہوں تو چلا ہی جاؤں۔'

'چلے جانا اتنی جلدی کیا ہے۔ گھر میں آؤ، کم سے کم چائے تو پی لو۔'

میں اس کے سامنے ساکت کھڑا رہ گیا۔ میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس دوران وہ خود ہی ایک طرفہ فیصلہ کرتے ہوئے بولی:

'چلو، اندر آؤ۔'

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا، آس پاس کوئی نہ تھا۔ مجھے لمحے بھر کو ہچکچاتا دیکھ کر اس نے گردن سے اندر آنے کا اشارہ کیا اور میں گھر کے اندر چلا گیا۔

وہ مجھے سیدھے رسوئی گھر میں لے گئی۔ بیٹھنے

کے لئے پیڑھی دی، چائے کے لئے پانی رکھا۔ پھر وہ مجھ سے بمبئی کی باتیں کرنے لگی۔ بولتے بولتے اس نے پونہ اور ممبئی میں رہنے والے اپنے بھائیوں کا ذکر کیا۔ اس نے کہا:

'میں بھی ممبئی آنے والی ہوں۔'

'آؤ، کب آؤ گی؟' میں نے پوچھا۔

'آؤں گی۔ اپنا پتہ دے کر جانا، بمبئی میں تم سے ملوں گی۔' اس نے چائے کی پیالی بھر کر میرے سامنے رکھی۔

میں نے خاموشی سے چائے ختم کی۔ کچھ دیر بعد اس سے پوچھا، 'تم یہاں اکیلے کیسے رہتی ہو؟'

'اس میں کیا ہے؟ گھر میں چچیرا بھائی ہے نا؟'

'تو کیا ہوا؟' میں نے کہا۔ پھر پوچھا، 'تم شادی کیوں نہیں کرتیں؟'

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور مجھے خیال ہوا کہ مجھے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہئے تھا۔ وہ اٹھی اور وہاں ایک الماری میں رکھا ہوا ایک خط نکال کر میری طرف اچھالا۔ 'یہ چٹھی پڑھو۔'

میں نے چٹھی پڑھی، اس میں لکھا تھا، ''تم بمبئی چلی آؤ۔ پھر شادی طے کرنا آسان ہوگا۔ دو ایک اچھے رشتے نظر میں ہیں۔ ان میں ایک تو خاص اچھا ہے۔ پیسے کا بندوبست بھی دیکھ لیں گے۔ آنے والے بیساکھ کے مہینے میں نپٹا سکیں گے۔''

خط پر ڈیڑھ سال پہلے کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے تعجب سے کہا، 'یہ تو ڈیڑھ سال پرانی چٹھی ہے۔'

'ہاں، لیکن تم نے یہ بات چھیڑ دی اس لئے میں نے تمہیں ایک نمونہ دکھایا۔ ایسی چٹھیاں ہمیشہ آتی رہتی ہیں۔ وہی مضمون ہوتا ہے، وہی بمبئی کا بلاوا۔ اگر میں بمبئی نہ گئی تو اگلے بیساکھ میں ٹھیک نہیں بیٹھے گا۔'

اس نے آنگن میں بکھرے ہوئے سوکھے پتوں پر نظر جمالی۔ میں جان گیا کہ وہ کچھ بے چین سی ہو گئی ہے۔ بھائیوں کی چٹھیوں میں اسے اپنائیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ گھر میں چچیرا بھائی رہتا تھا لیکن وہ اس پر کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ اب تو اس نے گھر کے بیچ دیوار کھینچ کر دو حصے کر لئے تھے۔ وہ آدھے گھر میں اکیلی رہتی تھی۔

پھر وہ میری طرف مڑ کر بولی۔ 'میری بات رہنے دو، اپنی کہو، تم کب بریانی کھلاؤ گے؟'

میں اس کے سوال کا رخ بھانپ گیا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر اس سے پوچھا:

> وہ گونتا کے یہاں رہا کرتا تھا۔ قصبے سے ہم ہی دونوں راشٹر سیوا دل میں جاتے تھے۔ صبح سویرے ہم دونوں بازار تک دوڑتے تھے۔ میں گورے کو بھور کے وقت جگانے آیا کرتا تھا۔ گونتا اور وہ برآمدے میں سوتے تھے۔ میں باہر کھڑے ہو کر اسے پکارتا، لیکن وہ آسانی سے نہیں جاگتا تھا۔ گونتا مسلسل جاگتا اور کھانستا رہتا تھا۔ اسے دق تھی۔ وہ گورے کو جگاتے ہوئے کہتا۔ ارے اٹھ! وہ مسلمان کا لڑکا تجھے بلانے آیا ہے۔ گورے جیسے تیسے اٹھتا اور منھ دھو کر میرے ساتھ بازار کی طرف دوڑنے لگتا۔ راستے میں ہم پہلے ایک ہوٹل پہ جا کر گرما گرم چائے پیتے۔ گورے منھ بنا کر بولتا۔ سوری، ہاں؟ میں تمہیں گھر میں نہیں بلا سکتا۔

'تم بریانی کیسے کھاؤ گی؟'

'کیوں نہیں؟ میں بریانی کھاتی ہوں۔'

'واقعی؟ میں نہیں مانتا'

'نہ ماننے کی کیا بات ہے۔'

'کیسے مان سکتا ہوں۔ اسکول میں میں نے تمہیں کھجور دی تھی لیکن تم نے یہ کہہ کر واپس کر دی تھی کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ نہیں کھاتے۔ اس ایک بار کے سوا میری اور تمہاری اسکول میں کوئی بات نہیں ہوئی لیکن مجھے وہ بات اب تک یاد ہے۔'

وہ آپ ہی مسکرائی۔ پھر مجھ سے پوچھا:

'یہ کتنے سال پہلے کی بات ہے؟'

'بیس ایک سال ہو گئے ہوں گے۔'

'بیس سال! اس وقت تو میں چھوٹی سی بچی تھی۔ مجھے کسی بات کی سمجھ نہیں تھی۔ گھر کے بڑے جو کچھ کہتے تھے، میں وہی کرتی تھی۔ اس عمر میں ہر کوئی ایسا ہی کرتا ہے لیکن ان بیس سالوں میں دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ تم بدل گئے، میں بھی بدل گئی۔'

'تم غلط سمجھتی ہو' میں نے بات کاٹ کر کہا۔ 'میں نہیں بدلا جیسا تھا ویسا ہی ہوں، تمہیں بتاؤں؟ آج میں نے زندگی میں پہلی بار اپنے قصبے کے کسی براہمن کے رسوئی گھر میں قدم رکھا ہے اور یہاں بیٹھے ہوئے مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔'

'عجیب کیوں لگ رہا ہے؟ اتنے برس تم یہاں تھے ہی نہیں۔ نہیں تو اس سے پہلے ہی ایسا ہو جاتا۔ اب لوگ پہلے کی طرح پرانے خیال کے نہیں رہے ہیں۔'

'نہ رہے ہوں، مگر میرے ذہن میں کچھ رواج اب بھی قائم ہیں۔ تمہیں گورے یاد ہے؟'

'ہاں یاد ہے، اچھی طرح یاد ہے۔ اس کا کیا ذکر ہے؟'

وہ گونتا کے یہاں رہا کرتا تھا۔ قصبے سے ہم ہی دونوں راشٹر سیوا دل میں جاتے تھے۔ صبح سویرے ہم دونوں بازار تک دوڑتے تھے۔ میں گورے کو بھور کے وقت جگانے آیا کرتا تھا۔ گونتا اور وہ برآمدے میں سوتے تھے۔ میں باہر کھڑے ہو کر اسے پکارتا، لیکن وہ آسانی سے نہیں جاگتا تھا۔ گونتا مسلسل جاگتا اور کھانستا رہتا تھا۔ اسے دق تھی۔ وہ گورے کو جگاتے ہوئے کہتا۔ ارے اٹھ! وہ مسلمان کا لڑکا تجھے بلانے آیا ہے۔ گورے جیسے تیسے اٹھتا اور منھ دھو کر میرے ساتھ بازار کی طرف دوڑنے لگتا۔ راستے میں ہم پہلے ایک ہوٹل پہ جا کر گرما گرم چائے پیتے۔ گورے منھ بنا کر بولتا۔ سوری، ہاں؟ میں تمہیں گھر میں نہیں بلا سکتا۔ تم تو

جانتے ہی ہو کہ میں دوسروں کے یہاں رہتا ہوں۔ وہ سب سنگھ (RSS) والے ہیں۔

'اس قصے کو بھی پندرہ بیس سال تو ہو گئے ہوں گے، ہے نا؟'

'ہاں۔ لیکن گنونتا کی تیز نگاہ مجھے اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے پرانے خیالات کا مجھے اب بھی خیال آتا ہے۔'

'گنونتا کو مرے ہوئے دس سال ہو گئے۔' اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ 'اور مرنے سے پہلے وہ مدد مانگنے کئی بار مسلمان زمینداروں کے در پر گیا تھا۔ اتنے دن تمہارا گاؤں سے کچھ رابطہ نہیں رہا۔ اب ایک دوسرے کے گھر جانا اور ساتھ کھانا کوئی عجیب بات نہیں رہی ہے۔ مجھے تو تم پر تعجب ہوتا ہے، اتنے سال ہو گئے شہر میں رہتے ہوئے۔ اپنے آپ کو اتنا اونچا نیتا سمجھتے ہو۔ سماج بدلنے کی باتیں کرتے ہو۔ انقلاب کی کہانیاں سناتے ہو اور اس تبدیلی پر ناک سکیڑتے ہو۔'

اس کی دلیل مضبوط تھی۔ میں اس کے حملے سے بوکھلا گیا لیکن پھر میں نے کہا، 'تمہاری بات غلط ہے۔ میں تبدیلی کا مخالف نہیں ہوں۔ میرے ذاتی بھائی میری اکثر باتوں کو غلط سمجھتے ہیں لیکن وہ بات الگ ہے اور تمہارا برتاؤ الگ ہے۔ سدھار کے بارے میں تمہارا خیال غلط ہے۔ سدھار کا مطلب بداخلاق ہونا نہیں ہے۔'

'آہاہا،' اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔ 'بداخلاقی کیسی؟' تمہارے گھر چائے پینا بداخلاقی ہے؟ تمہیں یہاں بلانا بداخلاقی ہے؟ بریانی کھانا بداخلاقی ہے؟ پھر خوش اخلاقی کیا ہے؟ وہ جو دھوبن کرتی ہے؟ جو سدام کرتا ہے؟

اس سے دھوبن اور سدام کا ذکر سن کر میں بھی چڑ گیا۔ دھوبن کی بات مت کرو۔ لوگ تمہارے بارے میں کیا باتیں کرتے ہیں، معلوم ہے؟'

'کیا باتیں کرتے ہیں؟' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

'کہتے ہیں تمہارا میرے بھائی کے ساتھ سمبندھ ہے۔'

'یہ جھوٹ ہے..... بالکل جھوٹ!'

'لوگ کیا بلاوجہ کہتے ہیں؟' میں نے پوچھا۔

'یہ میں کیسے کہوں؟'

'ٹھیک ہے! تو پھر اس سے تمہارا رشتہ ہے کس قسم کا؟ تم ہمیشہ آتی ہو، اس کے بارے میں پوچھتی ہو، اس سے بار بار ملتی ہو، یہ تمہیں غلط نہیں لگتا؟'

'اس میں غلط کیا ہے؟ ہمارے اچھے تعلقات ہیں، اوروں سے کچھ بڑھ کر، بس اتنا ہی۔'

'اچھے تعلقات ہیں، بس اتنا ہی؟'

گھر میں سب کو فکر تھی کہ میں کہاں چلا گیا ہوں۔ رات کا کھانا ہو گیا۔ بابا باورچی خانے سے نکل کر اپنی چارپائی پر جا لیٹے۔ میں روز کی طرح سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ بھائی دروازے پر منڈلا رہا تھا۔ میری طرف مڑ کر اس نے پوچھا، 'تم سمتی کے گھر گئے تھے۔؟'

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے کیسے معلوم ہوا؟ بظاہر اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں خود سے گیا بھی نہیں تھا لیکن میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

'تم نے اس سے کیا کہہ دیا؟ کیا اپدیش دیا؟'

اس نے دوبارہ سوال کیا۔ اس کی آواز اونچی ہو گئی یعنی سمتی اس سے ملی تھی یا وہ اس سے ملا تھا۔ اب جواب دینا ناگزیر ہو گیا۔ میں نے کہا:

'ہاں، صرف اچھے تعلقات۔'

'لیکن وہ بھی کیوں، اس کی کیا وجہ ہے؟'

'مگر کیوں؟'

میں چپ ہو گیا۔ اس کے سوال کا جواب دینا میرے بس میں نہ تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس سے یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی کیونکہ اب وہ میری طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی۔ سنجیدہ ہو کر باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا اور آنکھوں کے کونے نم ہو گئے۔

'یہ ٹھیک نہیں ہے۔' میں نے کہا۔ میرے لفظ میرے کانوں میں گونجتے رہے اور مجھے اس پر ترس آنے لگا تھا۔ میں نے اس سے کٹھور برتاؤ کیا ہے۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ باہر اندھیرا چھانے لگا ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ بے چین سی دکھائی دیتی تھی۔ میرے اٹھتے ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا: 'دیر ہو گئی۔ اب میں چلتا ہوں۔'

وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ جاتے ہوئے میں نے اس سے شرمندہ سے لہجے میں کہا،

'میری بات کا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا نہیں تھا۔ اگر تمہیں برا لگا ہو تو بھول جاؤ۔ دراصل تمہیں نصیحت کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔'

اس کے چہرے سے اور بھی بیچارگی جھلکنے لگیں۔ مجھے احساس ہوا کہ میری بات بالکل بے معنی تھی۔ معافی مانگنے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں سیدھا گھر واپس آ گیا۔

گھر میں سب کو فکر تھی کہ میں کہاں چلا گیا ہوں۔ رات کا کھانا ہو گیا۔ بابا باورچی خانے سے نکل کر اپنی چارپائی پر جا لیٹے۔ میں روز کی طرح سیڑھیوں پر جا بیٹھا۔ بھائی دروازے پر منڈلا رہا تھا۔ میری طرف مڑ کر اس نے پوچھا، 'تم سمتی کے گھر گئے تھے۔؟'

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے کیسے معلوم ہوا؟ بظاہر اس میں چھپانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں خود سے گیا بھی نہیں تھا لیکن میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

'تم نے اس سے کیا کہہ دیا؟ کیا اپدیش دیا؟'

اس نے دوبارہ سوال کیا۔ اس کی آواز اونچی ہو گئی یعنی سمتی اس سے ملی تھی یا وہ اس سے ملا تھا۔ اب جواب دینا ناگزیر ہو گیا۔ میں نے کہا:

'یونہی ادھر ادھر کی باتیں کیں۔'

'کیا؟ کیسی ادھر ادھر کی باتیں؟'

'یونہی عام قسم کی ہدایتیں کیں۔'

'اسے ہدایت دینے والے تم کون ہو؟'

'کوئی نہیں۔' اس نے گھر میں بلایا۔ میں چلا گیا۔'

'تم تو کھیت جا رہے تھے نا؟'

'لیکن وہ وہیں دروازے میں بیٹھی تھی۔ کہنے لگی، چائے پیئے بغیر مت جانا۔ سو میں اندر چلا گیا۔ پھر وہ بریانی کھانے کی باتیں کرنے لگی؛ اس پر مجھے تعجب ہوا۔ اس طرح بات چھڑ گئی۔'

'کون سی بات؟'

اس کے جرح کے لہجے پر میں چڑ گیا۔ میں نے اس سے نرمی سے کہا، 'تمہاری اور اس کی بات۔'

'میری اور اس کی کیا بات؟'

'یہ مجھے معلوم نہیں۔'

'کیا تمہیں اس نے بتایا؟' اور وہ جلتے ہوئے انگارے جیسی نگاہ سے بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔

بھابی چولہے پر رکھے ابال پر آئے ہوئے دودھ میں پھونکیں مار رہی تھی۔ اس نے دودھ کی پتیلی چولہے سے اتارتے ہوئے ہنس کر کہا، 'اجی میرے بتانے کی کیا ضرورت! پورا گاؤں یہی باتیں کر رہا ہے۔ ان کو کیسے پتہ نہ چلتا۔'

'یہ سب جھوٹ ہے۔' وہ غصے میں آ کر چلایا۔ اس کا غصہ یہ گواہی دیتا معلوم ہوا کہ وہ جھوٹا احتجاج کر رہا ہے۔

'ٹھیک ہے۔' میں نے کہا۔ 'پھر تمہیں اتنی زور سے چلانے کی کیا ضرورت ہے۔؟'

'یہ جھوٹ ہے، اس لئے! لوگ مجھے بدنام کر رہے ہیں، اس لئے!'

'یہ لوگ، مطلب کون؟' بھابی نے پوچھا۔

'تم..... گاؤں والے..... سمتی کا وہ حرام خور بھائی اور گاؤں کے بدمعاش کلواڑی۔ لوگ جو اپنی حیثیت بھول گئے ہیں۔ ارے اس لڑکی کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔

'ہاں، وہ بھی یہی کہہ رہی تھی۔'

'کیا؟'

'یہی کہ ہماری بچپن سے جان پہچان ہے۔'

'دیکھو مجھ سے الٹی سیدھی باتیں مت کرو۔' اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔

تب ہی بھابی بیچ میں آ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی، 'آپ مہربانی کر کے خاموش ہو جایئے۔ آرام کرنے آئے ہیں تو آرام کیجئے۔'

'پہلے تم نے خود اسے بڑھاوا دیا اور اب اسے چپ رہنے کو کہہ رہی ہو۔' بھائی کڑک کر بولا۔

'واہ! بہت خوب!' اس نے دونوں ہاتھ سامنے پھیلائے۔ 'ان ذمہ داریوں کی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی۔ میرا بدن مٹی ہو گیا۔ یہ باجی راؤ اس وقت کہاں تھے؟ کیا کر رہے تھے؟ سیاست، نیتا گیری؟ تب اس کے پیروں میں کس نے بیڑیاں ڈالی تھیں؟'

'میں نے گھر کی ذمہ داری ٹال دی، یہی کہنا چاہتے ہو نا؟ مان لیا، لیکن ویسے تو میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔'

'کیا مطلب؟ پندرہ سال بیکار زندگی گزارنا کوئی غلط کام نہیں ہے؟'

'نہیں، میری نظر میں نہیں۔'

'واہ! تمہاری نظر میں! تو پھر میری نظر میں مجھ سے بھی کوئی غلطی نہیں ہوئی

'وہ لڑکی معصومیت سے میرے بارے میں پوچھتی ہے۔ اس کا بھی کوئی نہیں ہے۔ اس گاؤں میں اکیلی رہتی ہے اس لئے میں اس کی ضرورتوں کا خیال کرتا ہوں تو لوگ اسے الٹا کر دکھاتے ہیں اور یہ بھی الٹا سمجھتی ہے۔'

'یہ سچ نہیں ہے۔' میں نے غصے میں کہا۔ 'لوگ جو سمجھتے ہیں، وہ سچ ہے۔ بھابی پر کیوں غرا رہے ہو؟'

'اچھا، ٹھیک ہے، یہی سچ ہے۔ تو پھر؟ میرا کیا کرنا چاہتے ہو؟'

'کچھ بھی نہیں، یہ بات تم پہلے ہی مان لیتے! ٹھیک ہے لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ جو کچھ چل رہا ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔'

'تم مجھے نصیحت کرو گے؟'

'کیوں؟ اس میں اعتراض کی کیا بات؟ تمہارا بھائی ہونے کے ناطے میرا حق ہے۔'

'بڑے بھائی کو نصیحت؟'

'ہاں، اگر وہ غلطی پر ہو تو۔'

'اور اگر چھوٹا بھائی غلطی کرے تو؟' اس نے ٹھنڈا ہو کر پھر جرح کا رُخ اختیار کر لیا۔ 'کیا تب میں نے کچھ پوچھا تھا؟'

'کیا میں نے کوئی غلطی کی تھی؟'

'واہ!' وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ 'پندرہ سال میں آج تم گھر آئے ہو اور پوچھتے ہو مجھ سے کیا غلطی ہوئی۔ تمہیں شرم نہیں آتی ایسا سوال کرتے ہوئے؟'

'آپ ان سے ایسے کیوں بات کر رہے ہیں؟' بھابی ناراض ہو کر بولی۔ 'آپ بڑے ہیں، پوری ذمہ داری آپ کی ہی تھی۔ یہ جتانے کی کیا ضرورت ہے؟'

'واہ! بہت خوب!' اس نے دونوں ہاتھ سامنے پھیلائے۔ 'ان ذمہ داریوں کی وجہ سے میری یہ حالت ہوگئی۔ میرا بدن مٹی ہو گیا۔ یہ باجی راؤ اس وقت کہاں تھے؟ کیا کر رہے تھے؟ سیاست، نیتا گیری؟ تب اس کے پیروں میں کس نے بیڑیاں ڈالی تھیں؟'

'میں نے گھر کی ذمہ داری ٹال دی، یہی کہنا چاہتے ہو نا؟ مان لیا، لیکن ویسے تو میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔'

'کیا مطلب؟ پندرہ سال بیکار زندگی گزارنا کوئی غلط کام نہیں ہے؟'

'نہیں، میری نظر میں نہیں۔'

'واہ! تمہاری نظر میں! تو پھر میری نظر میں مجھ سے بھی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ تم صرف اپنی نظر سے دیکھتے ہو۔ نیتا بن کے یہی سیکھا ہے تم نے؟ ذرا اوروں

کی نظر کا بھی سوچو.....'

اس نے میری طرف پیٹھ کر لی۔ کچھ لمحے وہ وہیں کھڑا رہا۔ پھر پچھلا دروازہ دھڑ سے کھول کر باہر نکل گیا۔ اندھیرے میں پچھواڑے کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ بھابی کو میرے ذہن کی اذیت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے مجھے جا کر سونے کو کہا لیکن بہت دیر تک میں پاگلوں کی طرح باورچی خانے میں کھڑا رہا۔

دوسرے دن میں نے بابا سے کہا، 'اب میں جاؤں گا.....واپس.....'

'اتنی جلدی؟' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ان کے جھریوں بھرے چہرے پر غم کا تاثر جھلکنے لگا۔ 'تمہیں تو آرام کرنا تھا نا؟'

'ہاں، لیکن بمبئی میں بھی تو کر سکتا ہوں۔'

'بمبئی میں! اتنے سالوں میں کتنا آرام کیا؟' انہوں نے پوچھا۔ جو سوال میں اور وہ دونوں ٹالنا چاہتے تھے، انجانے میں وہی سوال پوچھ بیٹھے۔ 'کتنے دن آرام کرنا ضروری ہے؟'

'بہت! پانچ چھ مہینے۔'

'پھر آج ہی جانے کی کیا جلدی ہے؟'

اس پر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بمبئی میں کام کا بہانہ کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ رات کے اس واقعے سے میں بہت بددل ہو گیا تھا۔ میرے ذہنی سکون کو سخت دھچکا پہنچا تھا۔ یہ سمجھانا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

میرا دھیان ان کے چہرے کی طرف گیا۔ ان کے سامنے کھڑے رہنے سے مجھے خوف آنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا اب وہ پھر پچھلے پندرہ سال میری گھر سے غیر حاضری کا، میری آوارہ زندگی کا پہاڑا پڑھنے لگیں گے۔ میں ان کے سامنے اپنے پچھلے پندرہ سال کا حساب دینے کو تیار تھا۔ پندرہ سال پہلے ان کی نظر سے غلط معلوم ہونے والی چیزوں کا حساب چکانے کا میں عادی ہو چکا تھا لیکن ایسے موقعوں پر ہونے والی ذہنی اذیت کو سہنا اب ان کے لئے ممکن نہ رہ گیا تھا۔ کئی بار ان کے نپے تلے برتاؤ کے پیچھے میرے تئیں ایک تحسین کا جذبہ چھپا محسوس ہوتا تھا جس کی وجہ سے زندگی کے بارے میں ان کا جوش وخروش تھا۔

وہ جوش وخروش اب ڈھل چکا تھا۔ اب ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے۔ بے بسی کا احساس ان پر حاوی ہو چکا تھا۔ اب ان کی باتوں سے ظاہر ہونے والے دکھ اور بے تابی کے جذبے سے میرا دل زخمی ہونے لگتا۔ پندرہ برس کے اس عرصے میں ہماری مالی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بحران، قرض اور سبکی کے

میرا دھیان ان کے چہرے کی طرف گیا۔ ان کے سامنے کھڑے رہنے سے مجھے خوف آنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا اب وہ پھر پچھلے پندرہ سال میری گھر سے غیر حاضری کا، میری آوارہ زندگی کا پہاڑا پڑھنے لگیں گے۔ میں ان کے سامنے اپنے پچھلے پندرہ سال کا حساب دینے کو تیار تھا۔ پندرہ سال پہلے ان کی نظر سے غلط معلوم ہونے والی چیزوں کا حساب چکانے کا میں عادی ہو چکا تھا لیکن ایسے موقعوں پر ہونے والی ذہنی اذیت کو سہنا اب ان کے لئے ممکن نہ رہ گیا تھا۔ کئی بار ان کے نپے تلے برتاؤ کے پیچھے میرے تئیں ایک تحسین کا جذبہ چھپا محسوس ہوتا تھا جس کی وجہ سے زندگی کے بارے میں ان کا جوش وخروش تھا۔

بہت سے واقعات انہوں نے جھیلے تھے۔ ان دوران صرف میں ان تجربات سے دور رہا تھا۔ یہ بالکل اس طرح تھا جیسے آگ لگنے پر سارے گھر والے اندر پھنس جائیں اور ان میں سے ایک جو اتفاق سے باہر ہو گیا ہو، بچ نکلے۔ انہوں نے آگ کی ساری تپش برداشت کی تھی اور ان کے ذہن پر اس کے گہرے نشان تھے۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ میرے بچ نکلنے کو کس نظر سے دیکھیں گے۔

لیکن انہوں نے صرف اتنا کہا، 'جانا ہے تو چلے جاؤ لیکن طبیعت کچھ ٹھیک ہو جانے دو۔ کم از کم اتنی جلدی تو مت کرو۔'

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور میرے لئے وہاں کھڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔

اگلا دن میں نے اسی خاموش ادھیڑبن میں گزارا۔ کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ دستور یہی ہے کہ انسان ایک دوسرے سے زیادہ تر برا برتاؤ کرتے آئے ہیں۔ کبھی جان بوجھ کر اور کبھی اپنی خواہش کے برخلاف، وہ ایک دوسرے کے ساتھ تکلیف دہ طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس پر میں بددل کیوں نہ ہوں، اور کب تک؟

اور میرے کڑھنے کا مطلب ہی کیا ہے؟ خود میرا برتاؤ کیسا رہا ہے؟ کیا ایک بار میرا اپنا دل پارٹی میں کام کرنے والی اس بھوری آنکھوں والی لڑکی پر نہیں آ گیا تھا؟ اگرچہ وہ غیر اخلاقی طرزِ عمل کی مرتکب ہوئی تھی لیکن میں نے اسے پارٹی سے نکالے جانے کی مزاحمت بلکہ سخت مخالفت کی تھی۔ میرے منھ پر کوئی کچھ نہ بولا لیکن میرے پیٹھ پیچھے میرے اس موقف کو ضرور معنی پہنائے گئے ہوں گے۔ تب میں نے کیا کہا تھا؟ ایسے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر ہی آگے بڑھنا ہے۔ ہمیں سب کو شامل کرنا چاہئے۔ جہاں چار لوگ اکٹھے ہوں گے وہاں اچھے برے کا ملاپ تو ہوگا ہی۔ پورے سماج کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔

لیکن میری بات جھوٹ تھی۔ میں نے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے اسے اس فلسفے کا لبادہ پہنایا تھا۔ اسے بچانے کے لئے میں منافق بن گیا تھا۔ یہ میں بھی جانتا تھا اور وہ بھی۔ میں بہاؤ کے ساتھ بہہ گیا تھا۔ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا اور جیت بھی گیا تھا۔ وہ پارٹی ہی میں رہی اور اپنے پچھلے طرزِ عمل پر ہی قائم رہی۔

کیا حاصل ہوا مجھے؟ اس کے موہ میں میں نے حالات کو جوں کا توں رکھنے کا موقف کیوں اختیار کیا؟

میں نے اپنے اصول پر سمجھوتا کیوں کیا؟ پچھلے پندرہ سال اس طرح بھٹکتے رہنے سے میں نے کیا کمایا؟ کہیں کچھ ضرور غلط ہو رہا تھا۔ میری شخصیت میں سچائی اور سونے جیسا کھرا پن کہاں آیا تھا؟ میری کوشش اب بھی ناکافی تھی۔ میری تپسیا جھوٹی پڑ گئی تھی۔ بھائی کو قصوروار ٹھہرانے کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ بیچاری سمتی ہی نے کون سا گناہ کیا تھا؟

لیکن اسے اور مجھے ایک ہی ترازو میں نہیں تولا جا سکتا۔ میں پچھلے پندرہ سال کسی کوشش میں لگا رہا ہوں۔ کوئی آدرش میرے دل کے قریب رہا ہے۔ میں کسی تبدیلی کا خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اس کے پورا ہونے میں اب بھی بہت دیر ہے اور اب میری بیماری کی وجہ سے اس کام میں رکاوٹ آ گئی ہے۔ فی الحال مجھے اپنی صحت پر توجہ رکھنی چاہئے۔ سکون سے بیٹھنا چاہئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میں نے اپنا بمبئی لوٹنے کا ارادہ ترک کر دیا اور گھر پر آرام کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے ہوا میں ٹھنڈک بڑھنے لگی۔ میں نے آرام کرسی پچھواڑے کے آنگن میں رکھ لی اور بے فکر ہو کر اس پر بیٹھا رہنے لگا۔

اس کے بعد سے بھائی نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا یا بلکہ وہ میرے سامنے پڑنے ہی سے کترانے لگا۔ میں نے بھی اس پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اس جھگڑے کے بارے میں پھر گھر میں کوئی بات نہ ہوئی۔ بھابی نے بھی یہ بات نہیں چھیڑی۔

لیکن ایک دن میں آرام کرسی میں بیٹھا تھا کہ وہ پچھلے دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی کھڑا رہ کر وہ زور سے کھنکھارا اور اپنی عادت کے مطابق دروازے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ کچھ بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے پاس آیا۔ دوبارہ کھنکھارتے ہوئے بولا، تم گھر ہی میں بیٹھے رہتے ہو؟

'ہاں۔'

'اوب نہیں جاتے؟ گھومنا پھرنا چاہئے۔ طبیعت بہلے گی۔'

'ہاں۔'

'پھر باہر نکلتے کیوں نہیں؟'

'جی نہیں کرتا۔'

اس کے بعد سے بھائی نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا یا بلکہ وہ میرے سامنے پڑنے ہی سے کترانے لگا۔ میں نے بھی اس پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اس جھگڑے کے بارے میں پھر گھر میں کوئی بات نہ ہوئی۔ بھابی نے بھی یہ بات نہیں چھیڑی۔

لیکن ایک دن میں آرام کرسی میں بیٹھا تھا کہ وہ پچھلے دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی کھڑا رہ کر وہ زور سے کھنکھارا اور اپنی عادت کے مطابق دروازے میں بیٹھ گیا۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ کچھ بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور میرے پاس آیا۔ دوبارہ کھنکھارتے ہوئے بولا، تم گھر ہی میں بیٹھے رہتے ہو؟

'ہاں۔'

'اوب نہیں جاتے؟ گھومنا پھرنا چاہئے۔ طبیعت بہلے گی۔'

'ہاں۔'

'پھر باہر نکلتے کیوں نہیں؟'

'جی نہیں کرتا۔'

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا:

'کھیت میں گھاس کے گٹھے باندھے جا رہے ہیں۔ وہاں نگرانی کرنے کے لئے کوئی نہیں ہے۔'

'لیکن میں کھیت میں کیسے جا پاؤں گا؟ اتنی چڑھائی کون چڑھے گا؟' میں نے کہا۔

سمتی کے گھر کے پاس سے گزرنے والی اس پگڈنڈی پر پھر قدم رکھنے کی مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔

'ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔' اس نے کہا۔ 'ایسا کرو، گھاس کے گٹھے یہیں آ جائیں گے۔ انہیں گن کر وصول کر لینا۔'

'ٹھیک ہے۔'

وہ تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا۔ پھر کچھ اداس سا ہو کر چل دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں بھابی کھڑی تھی۔ میری نظر پڑتے ہی وہ جھٹ سے وہاں چلی گئی۔

مجھے احساس ہوا کہ گھاس کے گٹھوں کا صرف بہانہ تھا۔ بھائی کو مجھ سے بات کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے بھابی نے یہ بہانہ ڈھونڈا ہوگا۔

اگلے دن سے میں پچھلے دروازے میں آ کر بیٹھنے اور مزدوروں کے لائے ہوئے سوکھی گھاس کے بڑے بڑے گٹھے گننے لگا۔ گھر کے پچھواڑے گٹھوں کا انبار جمع ہونے لگا اور پچھّم کی طرف ڈھلتا ہوا سوج اس انبار کے پیچھے چھپ جانے لگا۔ پھر گٹھوں کا یہ انبار اور اونچا ہوتا گیا۔

ایک دن ہوا ناقابل برداشت حد تک تیز ہو گئی۔ اس میں ایسی برف جیسی دھاردار ٹھنڈ تھی جس سے بدن کپکپانے لگا۔ کہرا دن بھر چھایا رہنے لگا۔ دھوپ بہت دیر میں نکلتی۔

میں شام کے وقت گٹھوں کے اس انبار سے گھاس کھینچ کر، الاؤ سلگا کر تاپنے لگا۔ پھر گٹھوں کا وہ انبار پورا ہو گیا اور پچھواڑے کے آنگن میں لوگوں کی آرجار بند ہو گئی۔

میں شام کے وقت پچھواڑے کے آنگن میں کاٹتی ہوئی پاگل سرد ہوا کو جھیلتے ہوئے اکیلا بیٹھا رہتا اور جلتے ہوئے الاؤ کے سرخ شعلوں پر نگاہ جمائے رہتا۔

ایسی ہی ایک رات جب میں الاؤ کے پاس بیٹھا تھا، بھابی لپکتی ہوئی گھر سے باہر آئی اور مجھ سے کہنے لگی:

'کھیت میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ کسی کلواڑی مزدور نے ان پر حملہ کردیا ہے۔ آپ ذرا جاکر دیکھئے۔'

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور کھیت کی طرف روانہ ہوگیا۔ بابا کو اس واقعہ کی خبر نہ تھی۔ میں انہیں کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں پچھلے دروازے سے باہر نکلا لیکن بھائی راستے ہی میں مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا، 'کیوں رے، کیا ہوا؟'

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پل بھر اس اندھیرے میں میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک دم پھٹ پڑا۔ 'سالے کلواڑیوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔'

'مگر کیوں؟'

'وہ اپنے مویشی ہماری گھاس میں چرانے لے آئے تھے۔ میں نے انہیں ہنکایا تو گرما گرمی ہوگئی۔'

'تم نے گالی دی ہوگی؟'

'بالکل، چوروں کو گالی نہ دی جائے؟ کیا ان کے باپ کی گھاس ہے؟'

'لیکن گالی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اب یہ پہلے والا زمینداروں کا زمانہ نہیں رہا۔ ان سے کہہ دیتے کہ اپنے مویشی وہاں سے نکال لیں۔'

'ہاں، دیں گالیاں، غلطی ہوئی! پر کیا انہیں مجھ پر حملہ کرنا چاہئے تھا؟ وہ تو اچھا ہوا کہ میرے مزدور ساتھ تھے، نہیں تو مشکل ہوجاتی۔'

میں نے کہا، 'چلو! پہلے گھر چلتے ہیں۔'

وہ چپ چاپ میرے ساتھ گھر چلا آیا۔ کچھ کہے بغیر ہاتھ پیر دھوئے اور کھانا کھالیا لیکن اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اندھیرے میں پچھلا دروازہ کھولا اور ٹھنڈی ہوا کے جھکڑوں میں کھڑا ہوکر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا:

'یہ کلواڑی سالے اپنی اوقات بھول گئے ہیں۔ کہتے ہیں، زمینداروں کو نکال کر پاکستان بھیج دیں گے۔ دیکھتا ہوں کیسے نکالیں گے۔ کیا سمجھتے ہیں، سالے، زمینداروں پر ہاتھ اٹھانا اتنا آسان ہے؟'

جب وہ دروازے پر کھڑا یہ سب کہہ رہا تھا، تب میں اور بھابی باورچی خانے میں بیٹھے سب سن رہے تھے۔ بھابی کا اس بڑبڑاہٹ کی طرف کتنا دھیان تھا، کون جانے! اس نے کھانا کھایا اور باورچی خانے کی صفائی کرنے کے بعد اکیلی چولہے پر رکھی دودھ کی پتیلی کے پاس بیٹھی رہی۔

وہ چپ چاپ میرے ساتھ گھر چلا آیا۔ کچھ کہے بغیر ہاتھ پیر دھوئے اور کھانا کھالیا لیکن اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اندھیرے میں پچھلا دروازہ کھولا اور ٹھنڈی ہوا کے جھکڑوں میں کھڑا ہوکر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا:

'یہ کلواڑی سالے اپنی اوقات بھول گئے ہیں۔ کہتے ہیں، زمینداروں کو نکال کر پاکستان بھیج دیں گے۔ دیکھتا ہوں کیسے نکالیں گے۔ کیا سمجھتے ہیں، سالے، زمینداروں پر ہاتھ اٹھانا اتنا آسان ہے؟'

جب وہ دروازے پر کھڑا یہ سب کہہ رہا تھا، تب میں اور بھابی باورچی خانے میں بیٹھے سب سن رہے تھے۔ بھابی کا اس بڑبڑاہٹ کی طرف کتنا دھیان تھا، کون جانے! اس نے کھانا کھایا اور باورچی خانے کی صفائی کرنے کے بعد اکیلی چولہے پر رکھی دودھ کی پتیلی کے پاس بیٹھی رہی۔

'میں کورٹ جاؤں گا، کیس کروں گا، سالوں کی مشکیں کسوادوں گا۔' وہ زور سے چلایا، اور دھڑام سے دروازہ بند کرا پنے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے بھابی کی طرف دیکھا، وہ ابال پر آئے ہوئے دودھ پر پانی کی چھینٹے مارنے میں مصروف تھی۔ اس نے دودھ کی پتیلی چولہے سے اتاری اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

'ہنسو مت، اس کو سمجھاؤ، کورٹ کچہری کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔'

'لیکن کیوں، تم سمجھاؤ گی تو کیا بگڑ جائے گا۔ کچھ دیر پہلے تو کیسی گھبرا گئی تھیں۔'

اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ 'گھبرائی تو اس لئے تھی کہ کہیں ان کی جان کو خطرہ نہ ہو۔' اس نے کہا۔ 'آپ کو بھیجنا ہی میرے اختیار میں تھا، وہ میں نے کیا۔ ان کو سمجھانا میرے بس میں نہیں ہے اور مجھ سے ایسا کرنے کو کہئے بھی مت۔ کوئی فائدہ نہیں۔'

بابا کو دوسرے دن سب پتہ چل گیا۔ شاید بھائی نے ہی انہیں بڑھا چڑھا کر بتایا ہوگا کیونکہ ان پر اس کا بہت عجیب اثر ہوا۔ انہوں نے بھائی کو مقدمہ کرنے کے ارادے کی تائید کردی تھی۔

مجھ سے انہوں نے کچھ نہ کہا۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ میں انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کروں گا لیکن مجھے اپنی اس بے بسی پر تعجب ہوا کہ اس معمولی سے بات کو بڑھنے سے روک نہ سکا۔ آخر میں نے خود ہی ان سے جاکر پوچھا۔ 'آپ نے بھائی کو مقدمہ کرنے کے لئے کہا ہے؟'

'ہاں'، انہوں نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

'لیکن اصل میں ہوا کیا تھا، یہ کس کو معلوم ہے؟ ہم لوگ پوچھ تاچھ کرتے ہیں، معاملے کو یہیں نپٹالیں گے۔'

'ٹھیک ہے، نپٹا لو۔' پھر وہ روکھا، خشک لہجہ، 'مجھے انکار نہیں ہے، لیکن نمٹائے گا کون؟ سامنے کون آئے گا؟'

'میں سامنے آتا ہوں۔'

'دیکھ لو، نمٹ جائے تو اچھا ہی ہے۔'

اتنا کہہ کر وہ رک گئے اور کچھ دیر کے لئے میرا ذہن چکرا سا گیا۔ مجھے لگا اس معاملے میں پڑنا ٹھیک نہیں، جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ اگر کوئی دھما کا ہونا ہے تو

ہوجائے۔ اگر اس میں میں بھی جل جاؤں تو جلنے دو لیکن پھر آئندہ ہونے والے واقعات کی بھیانک تصویریں میرے ذہن میں گھومنے لگیں اور میں لرز گیا۔ یوں الگ تھلگ رہنا بے معنی تھا۔ بھائی کے ساتھ ہونے والے واقعے کے جو مزدور گواہ تھے، میں نے ان کو بلوایا۔ ان کا بیان سن کر میری بھی یہی رائے بن گئی کہ کلواڑیوں نے جان بوجھ کر جھگڑا چھیڑا تھا اور میں اپنے ہی تجویز کئے طریقہ میں پھنس گیا۔ پندرہ برس بعد غیر ارادی طور پر گاؤں کے جھگڑے میں پڑ گیا۔ میں نے وہ جھگڑا سلجھانے کی کوشش کی اور مسلمان ایک بار پھر مجھ پر برہم ہوگئے۔ پندرہ سال پہلے بھی وہ مجھ پر اسی طرح برہم ہوئے تھے اور گاؤں کے کلواڑیوں نے اپنی شکایت میرے پاس لاکر ان کا غصہ اور بڑھا دیا تھا۔ ایک رات وہ میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے، 'زمیندار اپنی زمین واپس مانگ رہے ہیں، ہماری بٹائی لینے سے انکار کر رہے ہیں، ہم کیا کریں؟'

جب وہ میرے پاس آئے تھے تو سب سے پہلے بابا سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ وہ بھاپ گئے کہ یہ لوگ کیوں آئے ہیں۔ انہوں نے پکار کر مجھے بلایا۔ میں باہر نکلا تو وہ مجھ سے بولے، 'یہ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔' ان کے پرسکون، بے پروا لہجہ سے میں پریشان ہوگیا۔ میرے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ میں بوکھلایا ہوا وہیں کھڑا رہ گیا۔ کلواڑی زمین پر بیٹھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے انہیں زمین سے اٹھ کر برآمدے میں بچھ پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ بے چین اور شرمندہ سے اوپر بیٹھے۔ پھر میں نے ان کہا، زمین کا قبضہ مت چھوڑنا، بٹائی میں جتنا دھیان دیتے ہو، اس سے زیادہ مت دینا۔ اگر وہ انکار کر رہے ہیں تو اتنے دھان کی قیمت انہیں ڈاک سے بھجوادو۔

'اور اگر پیسے بھی نہ لیں تو؟'

'وہ بعد میں دیکھیں گے، ابھی یہی کرو۔'

'وہ اٹھے اور رام رام کر کے چلے گئے۔'

بابا اسی طرح ساکت چبوترے پر بیٹھے رہے۔ میں خود کو جھینپا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

انہیں یہ بات پسند نہیں آئے گی کہ میں نے کلواڑیوں کو صلاح دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اس بات پر ملامت کریں گے کہ میں کلواڑیوں کو مسلمان زمینداروں کے خلاف بھڑکا رہا ہوں لیکن انہوں نے کچھ بھی نہ کہا۔ انہوں نے گلا صاف کیا اور تھوکا اور خاموشی کو توڑنے کے ارادے سے انہوں نے کہا، 'کیوں رے، آج مرار جی دیسائی چپلن میں آئے تھے، کیا کہا انہوں نے؟'

یہ بات جلد ہی سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ میں نے کلواڑیوں کو زمین کا قبضہ نہ چھوڑنے کی صلاح دی ہے۔ مسلمان غصے میں آ گئے لیکن انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ میرے سلسلہ میں انہوں نے شریفوں والا رویہ اختیار کیا کہ موالی کے سامنے پڑنا ٹھیک نہیں۔ اس کے بدلے انہوں نے بابا کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے بابا پر الزام دھرا کہ ان کی نرمی کی وجہ سے میں بگڑا جا رہا ہوں۔

اس سے زیادہ لاڈ کرنے کی ضرورت نہیں، انہوں نے کہا۔ کل وہ آپ پر ہی الٹ پڑے گا۔ یہ تو وہ کہنے ہی لگا ہے کہ خدا نہیں ہے، کل باپ کو باپ کہنے سے بھی انکار کر دے گا۔

بابا نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ مجھ سے بھی اس سلسلہ میں کچھ نہ کہا اور کلواڑیوں کو میری دی ہوئی صلاح ہی زمینداروں کے اپنی زمینوں سے محروم ہونے کی تمہید ٹھہری۔

لیکن اب پہلے کی کوئی تلخی باقی نہیں تھی۔ مسلمان اپنی زمینیں کھو ہی بیٹھے تھے۔ (کبھی نہ کبھی تو ایسا ہونا ہی تھا۔) اور اب وہ ماضی کا قصہ بھی ان کی یادداشت سے محو ہو چکا تھا۔ اب گئے زمانے سے زمینداروں کی شان و شوکت کی یادیں تازہ کرتے وقت وہ اس قصے کا مذاق سے ذکر کرنے لگے تھے۔ 'ارے یہ تو ہونا ہی تھا، تمہارا اس میں کیا دخل؟ تم اگر نہ ہوتے تو کیا زمینداری رہ جاتی؟' اس طرح وہ میرا مذاق اڑاتے۔ صرف بابا اس بابت خاموش رہتے۔ جب یہ واقعہ ہوا تب بھی خاموش رہے اور آج بھی خاموش تھے اور خود کو بے پروا ظاہر کر رہے تھے۔ (بشکریہ 'آج')

(جاری)

محبت کا قتیل

محمد عبدالحلیم عبداللہ
۱۹۱۳ ۱۹۷۰

اس خاتون کے بیٹے کو میں چند سالوں سے جانتا ہوں، اس کا تقرر ہمارے ساتھ دیوان میں ہوا تھا۔

جس دن وہ آفس میں داخل ہوا، ہم ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

وہ کیبن تلاش کر رہا تھا جو اس کے صاحب کے انتقال کے بعد سے خالی تھا، اب وہ جگہ اور میز سب کچھ خالی تھا، ہماری نظریں کہہ رہی تھیں: کیا سخت نوجوان ہے!

وہ متکبر اور مغرور نظر آرہا تھا۔ تکبر اس کے خوبصورت چہرے پر اس طرح مستحکم تھا کہ کوئی بھی اس کے ساتھ مذاق کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا غرور قلت کلام میں مستحکم تھا، وہ کسی کے ساتھ گفتگو میں شریک ہوتا اور نہ ہی کسی سے رائے طلب کرتا، اگر کرتا بھی تو بہت احتیاط کے ساتھ۔

اچانک مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ یہ خوبصورت ڈھانچہ جسے تکبر نے پھلا دیا ہے، اپنے اندر ایک سادہ اور خوبصورت دل سمایا ہوا ہے جس میں بے شمار خواہش اور تمنائیں موجود ہیں اور ایک ہی چیز اسے لوگوں سے دور کرتی ہے اور وہ ہے بدگمانی۔

وہ موسم گرما تھا جب ہم اس جگہ اکیلے تھے اور تمام ساتھی چھٹی پر تھے، خادم پیالیوں کو جمع کرنے اور ایش ٹرے خالی کرنے کے لئے آیا تھا۔

آج مہینے کا پہلا دن تھا، ہم اس خادم کی شہرت سے واقف تھے، میں نے دیکھا، خادم صدقی آفندی کو پریشان کن نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ کچھ کہے بغیر وہ کمرے سے چلا گیا۔ معذرت خواہی کرنے کے لئے دوبارہ آیا اور کیبن کے کناروں میں گویا کچھ تلاش کرنے لگا، میں نے میز کے دراز خانے کھولتے ہوئے از راہ مذاق اس سے کہا: آؤ، آؤ! یہاں دیکھو، شاید یہاں مل جائے۔

> محمد عبدالحلیم عبداللہ، مصر کے مشہور و معروف ادیب اور صحافی تھے۔ اپنی محض ۵۷ سال کی عمر میں انہوں نے متعدد مضامین، کالم، انشائیے، سفرنامے، رپورتاژ، ناول اور افسانے لکھے۔ وہ ابتدائی دور میں رسالہ 'مجمع اللغۃ العربیۃ' سے بھی وابستہ رہے، بعد ازاں انہوں نے مختلف جگہوں پر اپنی خدمات انجام دیں۔
>
> مصر کی ایک مشہور درسگاہ 'دارالعلوم العلیا' سے فارغ محمد عبدالحلیم عبداللہ ۲۴ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہیں عرب دنیا کے ۶ اہم ترین اعزازات سے نوازا گیا۔ 'محبت کا قتیل' ان کی مشہور کہانی ہے جسکا اردو ترجمہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سعید بن مخاشن نے کیا ہے۔
>
> (ایڈیٹر)

وہ اپنے طویل جسم کو حرکت دیتے ہوئے چلا گیا، مجھے اس پر ترس آیا، تھوڑی دیر بعد میں کام سے سلسلہ میں وہاں سے چلا گیا، جب میں دوبارہ آیا وہ صدقی آفندی سے اپنی بات مکمل کر چکا تھا اور جس وقت میں کرسی پر بیٹھ رہا تھا، وہ تیزی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

میں اپنے ساتھی کو بیک وقت اجنبی اور خوشی کی نظروں سے دیکھنے لگا، میں نے سگریٹ کی ڈبی جیب میں تلاش کرتے ہوئے اس سے پوچھا:

'کیا تم بھی اس کی باتوں میں پھنس گئے؟'

اس نے اوراق سے سر اٹھا کر چھوٹے منہ سے مسکراتے ہوئے کہا:

خدا کی قسم عمدہ! میرا بھروسہ کرو، خدا کی قسم عمدہ!

میں نے جواب دیا: مبالغہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ آدمی حیلہ باز اور خطرناک ہے۔

اس نے کہا: یقیناً، میں بھی جانتا ہوں۔

میں نے کہا: اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہم جانتے بوجھتے اس کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

'کیا اس نے تم سے پیسے لئے ہیں؟'

'ہاں، لیا ہے۔'

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

'بڑی عجیب بات ہے، تمہارے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ تم تو بہت محتاج آدمی ہو۔'

اس نے سانس لیتے ہوئے کہا:

'کیا تم اسے غفلت قرار دیتے ہو؟'

میں نے دوسری جانب دیکھ کر فائل پر گری سگریٹ کی راکھ صاف کرتے ہوئے کہا:

'یقیناً غفلت ہے۔'

وہ کہنے لگا:

'کاش میں غافل ہوتا اور تمام لوگوں سے محبت کرتا۔'

اس کی آنکھیں چھت پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ لمبے تار میں چھت سے لٹکنے والے چراغ کے سر کو دیکھنے لگا پھر مجھے دیکھ کر کہنے لگا:

'احمد! ایک منٹ کے لئے یہاں آؤ۔ اگر تمہارے پاس وقت ہو تو۔'

میں بانس کی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی ترکیب کثرت استعمال کی وجہ سے کمزور ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے دوسرا سگریٹ پیش کیا، آفس کی گھنٹی بجائی، وہی خادم اندر آیا، اس کی آنکھوں سے پریشانی غائب ہو چکی تھی، اطمینان کی وجہ سے چہرہ پرسکون اور بشاشت جھلک رہی تھی۔ اس نے ایک پیالی قہوہ طلب کیا اور پلٹ کر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

'کیا تمہیں میری آرزو عجیب لگتی ہے۔ میں خدا سے ایک تحفہ کا طلبگار ہوں۔ یقین جانو، میرے بھائی! لوگوں سے محبت کرنے والا غافل، بدگمانی کرنے والے محتاط سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے، مجھے میری دادی کا واقعہ ابھی تک یاد ہے یا میری ماں کا جس سے میں بہت محبت کرتا ہوں۔

میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے تفصیل جاننی چاہی، وہ کہنے لگا:

جب میں تین سال کا تھا، میں نے لوگوں کو اسے عجیب اور پریشان کن طریقہ سے لے جاتے ہوئے دیکھا جس کا مطلب میں نہیں جانتا تھا، سب رو رہے تھے، شام میں جب اس کے کمرے میں گیا، وہ موجود نہیں تھی، سب نے کہا: وہ سفر پر گئی ہے۔ میں اس کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگا، وہ نہیں لوٹی، اب میں اس عمر کو پہنچ گیا جہاں مجھے معلوم ہوگیا کہ بسا اوقات سفر کا مطلب موت ہوتا ہے۔

میں نے کہا: 'یقیناً تم بہت چھوٹے تھے۔'

اس نے کہا: مجھے بچپن کی موت کے مفہوم کی شکل اور موت کے غم کی مشکل سے نجات مل گئی اور بچے غافل ہوتے ہیں، محبت کی دنیا میں خوش ہوتے ہیں۔

میں نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا:

'کیا تم اس حد تک محبت کو پسند کرتے ہو؟'

اس نے تاکید میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا:

'ہاں، لیکن کبھی نفس کے اشتیاق تک میری رسائی نہیں ہوتی۔'

'کیوں!'

'وہ پرانی بات ہے۔'

'بہت پرانی؟'

'میرے بچپن کی۔ زیادہ سے زیادہ میری عمر ستائیس سال ہے، کیا یہ کم ہے؟'

'سنو!'

میرے والد کی صرف دو ہی اولاد ہیں۔ ایک بیٹی جس کی شادی ہوگئی ہے اور ایک لڑکا جو جوان ہوگیا ہے اور وہ میں ہوں۔ میری بہن مجھ سے بڑی تھی۔ بہت سارے امور میں اس کا اور میری ماں کا اختلاف رہتا تھا، میں تفصیلی طور پر تو نہیں البتہ بعض باتوں سے واقف ہوں لیکن میرا مقصد تمہیں میرے خاندان کا وہ واقعہ بتانا ہے جو ہماری گفتگو سے متعلق ہے اور اس محبت کے متعلق ہے جو غفلت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے اور اس احتیاط سے متعلق ہے جو ہسٹریا کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ سنو!

دو کمروں کے درمیان صرف ایک دروازہ حائل تھا، ایک میرا کمرہ جو مطالعہ کے لئے مختص تھا، اس وقت میری عمر بارہ سال تھی، دوسرے کمرے میں میری ماں اور بہن رہتی تھیں، میری ماں اور بہن کے درمیان شدید لڑائی کی آواز سن کر میں نے بات چیت ختم کر دی۔ یہ جھگڑا ہمارے گھر سے مہمانوں کے جانے کے بعد شروع ہوا تھا۔

مجھے بعض باتیں صاف سنائی دینے لگی، میری بہن ماں سے ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی کیونکہ انہوں نے دیرینہ تعلقات والی سہیلی سے سخت کلامی کی تھی جو کچھ عرصہ قبل ہی داغ بیوگی سے دوچار ہوئی تھی۔ میری ماں ان سے تعلقات کم کرنا چاہ رہی تھی کیونکہ وہ معاشی امور میں میرے والد کی مدد کی خواہاں تھی، میری ماں کے مطابق یہ صرف معاشی معاملہ نہیں ہے، یہ تو کوئی اور ہی پروگرام ہے، اس بیوہ کی انکساری نے اس کے جمال اور فتنہ میں چار چاند لگا دئے تھے۔ جب اس نے روتے ہوئے گھر کے دروازے پر کہا:

'خدا کی قسم! آج کے بعد میں تمہاری دہلیز پر کبھی قدم نہیں رکھوں گی۔' ماں نے کوئی جواب نہیں دیا، بہن اندر ہاتھوں سے آنسو چھپا رہی تھی۔

اس کے بعد وہ غریب عورت ہمارے گھر کبھی نہیں آئی۔ وہ اپنے معاملات میں خدا سے اور میرے والد کے علاوہ دوسرے لوگوں سے مدد لیا کرتی تھی، میری ماں نے بھی تعلقات استوار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ رات کی کہر میں اس کی یادیں دھندلی ہوتی گئیں۔ میری ماں کے مزاج کے لحاظ سے یہ باتیں عجیب نہیں تھیں، ان کے معاملات ہمیشہ اسی محور کے اطراف گھومتے تھے، ایسا اندیشہ جس سے نفرت پیدا ہوتی ہے یا وہ احتیاط جو ہسٹریا کا دوسرا نام ہے۔ وہ ہمیشہ مجھے ان ہی امور کی تلقین کیا کرتی تھی، مجھے ان امور سے نفرت ہونے لگی جس طرح زیادہ شراب پینے والا شراب سے متنفر ہو جاتا ہے۔

میں اسی لئے ایسا ہوں جس طرح تمہیں نظر آتا ہوں۔ میں خوف سے اسی وقت دور ہوتا ہوں جب مجھے اس کی ضد دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے، اس بخیل کے مانند جو اپنی اولاد پر کبھی کبھی سخاوت کا مظاہرہ کرتا ہے تاکہ انہیں بھی اسراف کا مزا معلوم ہو۔

صدقی خاموش ہوگیا کیونکہ خادم پیالیوں کے لینے کے لئے اندر آیا تھا۔ جب وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا، صدقی کہنے لگا:

میں نے اس حیلہ باز کو پیسے دئے ہیں، اس نے بہت مضبوط بہانہ تراشا ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے دوسرے ملازم کو بھی یہی بہانہ پیش کیا ہوگا۔ میں نے صرف غفلت کا مزہ یا محبت کا مزہ چکھنے کے لئے اسے دیا ہے۔ اگر چہ وہ حیلہ کے جام میں پیش کیا ہو۔

میں نے اپنے دوست سے کہا:

یہ تو عجیب بات ہے! تم اتنے ہوشیار ہو، مجھے معلوم نہ تھا۔ میرا مطلب ہے تمہاری فکر اتنی گہری ہے، مجھے اندازہ نہ تھا لیکن میرے بھائی! آج یہ بات کیسے؟

میں ہنس دیا، وہ کہنے لگا:

سب سے بڑا بیوقوف اس شرط پر تمہیں اپنے تجربوں سے آگاہ کرے گا جب تم اس کی زندگی میں اثر دار شخصیت کے حامل ہو۔

صدقی مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ پھر اٹھ کر کھڑکی کا دوسرا پٹ بھی کھول دیا تا کہ ہوا زیادہ سے زیادہ اندر آسکے۔

سامنے والے گوشہ سے ٹائپ رائٹنگ کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں، اس نے بیٹھ کر سانس لیا اور کہنے لگا:

میری بہن 'عنایات' ماں کے برعکس تھی۔

'کیا کہہ رہے ہو، 'تھی؟''

'ہاں، تھی، میں جانتا ہوں کیا کہہ رہا ہوں۔'

کیا اس کا مزاج بعد میں تبدیل ہو گیا؟

'وہ افسوس سے سر ہلانے لگا۔'

'تم قطع کلامی مت کرو، بات پوری سنو، انتظار کرو۔'

وہ میری ماں کے برعکس تھی، لوگوں سے محبت کرتی تھی، وہ بہت محبت کرنے والی تھی، وہ اپنے پرانے کپڑوں کے ٹھکانہ سے واقف ہونا چاہتی تھی لیکن ماں! وہ تو گھوڑے کی لگام کے مانند تھی جو اسے قابو میں رکھتی ہے ورنہ وہ بے قابو ہو جائے گا۔ شاید قدرت کو بھی یہی منظور تھا کہ اس کی نوجوان زندگی اس کے جذبات کی طرح مکمل ختم ہو جائے۔

ہماری خالہ کا ایک لڑکا تھا، جو ہمارے گھر اکثر آیا جایا کرتا تھا، میری ماں کو یقین تھا کہ وہ ان کی اکلوتی بیٹی سے شادی کرے گا، دونوں کے درمیان، جس کا علم بعد میں ہوا۔ محبت پروان چڑھ رہی تھی، پھر تعلقات میں سرد مہری آ گئی اور وہ ہمارے گھر کم آنے لگا۔ پھر اس نے آنا بند کر دیا۔

عنایات مرجھانے لگی۔ اس کی حالت متغیر ہو گئی، وہ اکثر تنہا رہنے لگی۔ اس کی یکسوئی بھی بار بار ٹوٹنے لگی، وہ گھنٹوں کمرے کا دروازہ بند کر کے روتی رہتی۔

اس کے اور ماں کے درمیان اس بات پر کافی جھگڑا ہوا، میرا خیال ہے کہ لڑکی نے ماں کو دل کے راز سے مطلع کر دیا تھا۔ میرا گمان ہے کہ محبت اور جدول ضرب (پہاڑا) کے درمیان لڑکی پر سختی کی، اس کا یہ ماننا تھا کہ خواہش چاک سے لکھا جانے والا کلمہ ہے، آسانی کے ساتھ لکھا بھی جاتا ہے اور اتنی ہی آسانی سے مٹا دیا جاتا ہے۔

عنایات کے قصہ کا اختتام دوسرے ناولوں کی طرح ڈرامائی انداز میں ہوا۔

ایک دن ہمیں یہ اطلاع ملی کہ خالہ کے لڑکے نے سگائی کر لی ہے، ہمیں یقین نہیں آیا، ہمیں اس وقت یقین ہوا جب دوسری لڑکی سے اس کی شادی طے ہو گئی۔ یہ دوسرا قصہ چھوڑو۔ اس کا ہمارے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس نے شادی کر لی، تمام لڑکیوں سے قطع تعلق کر لئے لیکن میری بہن اس سے قطع تعلق نہ کر سکی۔

ایسا لگتا ہے کہ محبت کی تقسیم دونوں کے درمیان منصفانہ نہیں ہوئی تھی، کیونکہ میری بہن نے اس کی بہ نسبت زیادہ حصہ پایا تھا اسی لئے طبعی طور پر تکلیف بھی اس سے حصہ میں زیادہ آئی تھی۔

صدقی خاموش ہو گیا۔ میں نے سر کو جنبش دیتے ہوئے مزید تفصیل طلب کی۔ اس نے کہا:

پھر عنایات بیمار رہنے لگی، دن بدن اس کی حالت خراب ہوتی گئی اور ایک شام اس کے سر پر موت کے پرندے چکر لگانے لگے۔ کتنی عجیب بات ہے ہم سعادتمندی پسند کرتے ہیں یا موت سے محبت کرتے ہیں!

وہ مسکرانے لگا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

میں اور میری ماں اس کے قریب تھے، میرے والد گھر سے باہر چلے گئے تھے، جوانی کے سورج کو ظہر کے وقت ڈوبتے ہوئے دیکھنے کی ان میں طاقت نہیں تھی، اسی لئے وہ باہر چلے گئے۔

میں بہن کے چہرہ کو غصہ، افسوس، محبت اور کینہ سے دیکھ رہا تھا۔ میں بعض کام کے لئے باہر آیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں، دروازہ کھول کر میں کمرہ میں دوبارہ آیا، وہ آنکھیں کھول کر مسکرانے لگی، اس کا چہرہ کھل اٹھا گویا زندگی کی شادابی دوبارہ سرایت کر گئی ہو لیکن اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سرگوشی کرنے لگیں۔ 'آپ آ گئے، یہ لوگ کہہ رہے تھے، آپ نہیں آؤ گے۔ آیئے!'

اس کے فوراً بعد اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور اس کے چہرے پر محبت کے آثار شفق کی اس روشنی کے مانند باقی رہ گئے جو سورج ڈوبنے کے بعد باقی رہتی ہے اور آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے۔ اس حادثہ کے بعد میری ماں لوگوں سے اور زیادہ بدظن ہو گئی اور محبت سے نفرت کرنے لگی۔

رات کے کہر میں تمام حادثات تاریکی میں دھندلے ہوتے گئے۔ میں اب ماں کے ساتھ اکیلا رہتا ہوں۔

اس حیلہ باز کے ذریعہ میں محبت کو گہرائی سے آزمانا چاہتا ہوں، جو غفلت کے درجہ تک پہنچ جائے، تمام واقعات مجھے یاد آنے لگے۔

دوسال کا عرصہ گزر گیا۔

اس دوران صدقی بالکل نہیں بدلا۔ اپنے آپ میں رہنے والا خوبرو اور خاموش، شہد کے چھتے کے مانند کوئی نہیں جانتا کہ اس میں کتنا شہد پنہاں ہے۔ ایک دن اچانک ہمیں یہ پتہ چلا کہ اس کا ساحلی شہر کے ایک اچھے مرکز پر تبادلہ ہوگیا ہے۔

اس کے پاس قاہرہ میں موجود ماں کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، اسے بھی ڈاکٹروں کی نگرانی کی ضرورت تھی، نہ ہی وہ اس مقام کو چھوڑ سکتی تھی اور نہ ہی کسی اجنبی شہر میں سکونت اختیار کرسکتی تھی۔

صدقی نے مجھے بتایا کہ اس نے ماں کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا ہے اور ہفتہ دو ہفتہ حسب ضرورت آتا رہے گا۔ دونوں کی جدائی بہت مشکل تھی کیونکہ وہ دونوں ایک دن بھی الگ نہیں رہے تھے۔

صدقی نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی ماں کی خیریت لیتا رہوں کیونکہ وہ مجھے پہچانتی تھی۔ اگر چہ اس نے مجھے زیادہ نہیں دیکھا تھا۔ صدقی نے بڑے اعتماد سے کہا کہ میں اس کی ماں کا بھروسہ حاصل کرسکتا ہوں۔ کس معاملہ میں؟ کسی میں نہیں! شاید اس کا بھروسہ بہت قیمتی شئے ہے اور صرف انہیں حاصل ہوتا ہے جن پر خدا کا فضل اور توفیق ہوتی ہے اور ہم ہنسنے لگے۔

جب میں نے انہیں دوبارہ دیکھا تو مجھے لگا کہ میں اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں، وہ بالکل بدل گئی تھی، بہت بوڑھی اور سخت ہوگئی تھی، ایسا لگتا تھا بغیر پر کے بازوہوں اور بغیر پر کے بازو کی قیمت کیا ہوتی ہے جو حتیٰ یہ کہ خود کی بھی حفاظت نہیں کرسکتے۔

خوف اس کی آنکھوں میں بوڑھاہی سہی لیکن زندہ تھا۔ جب کبھی میں اس کے قریب بیٹھتا، وہ مجھے زندگی کے حوادث اور نوادر نہیں سناتی تھی جس طرح عام طور پر عمر رسیدہ عورتیں کیا کرتی ہیں اور وہی بڑھاپے کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔ وہ ڈر وخوف کے علاوہ کچھ بھی ذکر نہیں کرتی تھی، میں نے دل ہی دل میں کہا: اے خدا! ہم پر رحم فرما، جب وہ قوی تھی تو اس وقت خود سے زیادہ قوی لوگوں سے ڈرتے ہوئے زندگی گزار دی اور کمزوری کے دن موت سے ڈرتے ہوئے گزار رہی ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟!

اس کے بیٹے کے جانے کے بعد گھر کی خادمہ بھی دوسرے دن کام چھوڑ کر چلی گئی۔ اب وہ مکان میں تنہا رہنے لگی۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ اسے اکیلے سونے میں ڈر لگتا ہے، میں نے کہا کہ میں یہاں سونے کے لئے تیار ہوں۔ وہ موافقت میں خاموش تو ہوگئی لیکن منھ میں بڑبڑانے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پس و پیش کررہی ہے، میں نے بھی ارادہ ملتوی کردیا۔

دوسرے دن صبح میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، اس نے بہت دیر کے بعد دروازہ کھولا، اس کے چہرہ پر فنا کے آثار جھلک رہے تھے، سلام کے جواب میں اس نے کہا:

میرے بیٹے کو تار کے ذریعہ اطلاع دے دو۔ میں بیمار ہوں!! جب میں جانے لگا تو کہنے لگی: کل صبح بھیجو، تھوڑا انتظار کرو۔

میں شام میں گیا تو وہ بہت تھکی ہوئی تھی، میں نے تار بھیج کر اسے بلا لیا۔ دوسرے دن آفس نہیں گیا، مجھے کسی چیز کا خدشہ ہورہا تھا، صدقی کی ماں نے مجھے گاؤں میں رہنے والی عورت کا پتہ بتایا۔ میں نے جا کر اسے خبر دے دی۔ میرے لوٹنے کے دو گھنٹے کے بعد وہ عورت بڑی پریشان حال آئی، ایسا لگ رہا تھا گویا اس نے آدھی زمین اپنے کندھے پر اٹھالی ہے۔

مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ بوڑھی عورت وہیں رک گئی ہے یا پھر چلی گئی، میں اس امید کے ساتھ روانہ ہوگیا کہ میرے واپس آنے تک اس کا بیٹا آجائے گا لیکن میرے آنے کے بعد بھی گھر کی حالت جوں کی توں برقرار تھی۔ خاموش اور وحشت ناک، اس کھیت کے مانند جہاں کھیتی کاٹنے کے بعد رات میں صرف حرص باقی رہتا ہے۔ اس کی آخری گھڑی بالکل اسی طرح تھی۔

دروازہ پر صدقی نے کھٹکھٹایا تو ہم سمجھ گئے کیونکہ وہ پریشان کن کھٹکھٹاہٹ تھی، ماں کی پیشانی کو بوسہ دیا، اس کی آنکھیں بند تھیں، بزرگ خاتون کے چہرے پر راحت کے آثار نہیں تھے۔ حال سے؟ ماضی سے؟ یقینی طور پر!! موت کے بعد اسے تو صرف خدا ہی جانتا ہے۔

میں نے اس کے بیٹے کو دیکھا، وہ میری جانب دیکھنے لگا، ہمیں تمام واقعات یاد آنے لگے۔ ہم نے کوئی گفتگو نہیں کی، ہم موت سے قبل عنایات کی باتوں کو یاد کرنے لگے جو سوچ رہی تھی کہ اس کا محبوب آیا ہے۔ ''آپ آگئے، یہ لوگ کہہ رہے تھے، آپ نہیں آئیں گے۔ آیئے!''

ہمیں یہ بات اس لمحہ یاد آئی جب صدقی کی ماں کی رشتہ دار دروازہ کھول کر اندر آئی جہاں اس کی ماں موجود تھی، اچانک بیمار ماں پست آواز سے کہنے لگی:

''تم آگئے، لیکن عنایات تم سے محبت نہیں کرتی ہے، چلے جاؤ!!''

اس کا چہرہ جھریوں سے سکڑ گیا، سخت مزاجی کے آثار آخری سانس تک اس پر طاری تھے۔ بیٹی کے انتقال کے وقت اس کے چہرے پر محبت کی بشاشت تھی اور ماں کے انتقال کے وقت اس کے چہرے پر کراہت کا تکدر ہے۔

میں اس جیسے حالات میں بعض امور میں صدقی کی مدد کے لئے زینہ سے اترتے ہوئے دل ہی دل میں کہنے لگا:

نہیں! خدا خیر کرے..... اگر دو میں سے ایک حاضری ضروری ہو تو ہمیں عنایات کی طرح موت نصیب ہو اور میں محبت کا قتیل بن جاؤں۔

❑❑❑

زیر تبصرہ کتاب میں کل ۲۸ مضامین اور کتاب ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاہنواز قریشی طولانی عبارت آرائی کے قائل نہیں ہیں۔ کتاب میں شامل تمام مضامین وہ ہیں جو ریڈیو، سیمیناروں یا رسائل کے خصوصی شماروں میں لکھے گئے تھے۔ کتاب کی ابتدا مصنف کے مضمون 'کچھ اس کتاب کے بارے میں' سے ہوتی ہے۔ جس میں وہ اپنی تخلیقات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ادبیات وشخصیات میں شامل مضامین کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ تنقیدی مضامین ہیں۔ میں نقاد ہونے کا دعویٰ کرنے کی جسارت بھی نہیں کرسکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ بعض مضامین میں تجزیاتی انداز اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بعض مضامین کو تاثراتی بھی کہا جا سکتا ہے جس سے انکار بھی نہیں کرسکتا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور انیس اشفاق سے متعلق مضامین کا انداز تحریر کچھ مختلف ہے۔''

کسی کتاب کے مطالعہ کے وقت قاری سب سے پہلے جس چیز سے دوچار ہوتا ہے وہ ہے مضمون کی لفظیات اور انداز بیان یعنی اندازِ تحریر۔ شاہ نواز قریشی کے انداز تحریر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے تراشنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب انتہائی شستہ اور سادہ ہے۔ ظرافت کی چاشنی اسے اور دلکش بناتی ہے۔ سلاست اور روانی اس حد تک ہے کہ قاری کو اکتاہٹ کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ کتاب میں شامل تمام مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد مصنف کی محنت اور اس کے اندازِ تحریر کی انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ادب نام ہے احساسات کو لفظوں کی شکل میں ڈھالنے کا۔ ادب دراصل وہی ہے جس میں تاثیر ہو، فکر کی گہرائی ہو اور یہ صورت حال اسی وقت ممکن ہے جب ادب میں ادیب کی شخصیت شامل ہو۔ اس سچائی کا احساس زیر تبصرہ کتاب کو پڑھتے وقت بار بار ہوا۔ کتاب میں شامل تمام مضامین فکر انگیز ہیں مگر کتاب کا سب سے طویل مضمون جو ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، وہ بالکل منفرد ہے۔ 'لکھنؤ کا ادبی ماحول؛ کچھ یادیں' بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس مضمون میں مصنف نے چالیس سال کے عرصہ کا احاطہ کیا ہے۔ حقیقت میں شاہ نواز قریشی نے اس مضمون کو تحریر کرتے وقت اپنے قلم سے کیمرے کا کام لیا ہے اور پورے چالیس سال کی مدت میں لکھنؤ کی ادبی تنظیموں، ان کے پروگراموں اور اس میں شامل ہونے والی شخصیات کے تعلق سے ایسے نایاب کلوزاپ پیش کئے ہیں جو صرف دلچسپ ہی نہیں بلکہ معلوماتی بھی ہیں۔ یہ کلوزاپ نئی نسل کے لئے ایک گرانقدر ادبی سرمایہ ہیں۔ چند کلوزاپ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

اس موقع پر صدارتی تقریر میں عمیق حنفی نے بڑی دلچسپ اور معنی خیز باتیں کہیں۔ انہوں نے کہا ''اس جلسے کی صدارت کے لئے جب مجھ سے کہا گیا تو مجھے حیرت ہوئی، کیونکہ میں افسانے کا آدمی نہیں ہوں لیکن پھر میں نے سوچا کہ اگر میں نے انکار کر دیا تو پھر صدارت رام لعل کریں گے۔ اس ڈر سے میں نے یہ آفر قبول کر لیا۔ ان کے ان

مبصر : منظور احمد صدیقی
قیمت : 150 روپئے
ناشر : شاہنواز قریشی (مصنف)

ملنے کا پتہ

دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

جملوں پر پریس کلب کا ہال قہقہہ زار بن گیا۔

اپنے خطاب میں عمیق حنفی نے مزید کہا: میں ماس میڈیا کا آدمی ہوں۔ شمس الرحمن فاروقی ماس کمیونیکیشن کے آدمی ہیں لیکن ہم دونوں جدید ادب کے چکر میں پڑ کر ترسیل کی ناکامی کے المیے کا شمار ہو گئے ہیں۔ (ص ۱۴۵)

پھر نیر صاحب کا دوسرا افسانوی مجموعہ 'عطر کافور' شائع ہوا تو اس کے اجراء کی تقریب اردو اکادمی (قیصر باغ) کے ہال میں منعقد ہوئی جس میں شمس الرحمن فاروقی اور سید محمد اشرف بھی شریک ہوئے۔ اس موقع پر سبھی مقررین نے نیر صاحب کے افسانوں کی زبردست ستائش کی۔ انیس اشفاق نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ نیر صاحب سے اچھی نثر پورے برصغیر میں نہیں لکھی جارہی ہے۔ اس پر وہاں موجود ابراہیم علوی نے فقرہ کسا: اشرف آباد کو آپ بر صغیر کہہ رہے ہیں۔ (۱۴۷)

کتاب کے مطالعہ سے جو دوسری بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ شاہ نواز قریشی ادب میں دوستی یاری نبھانے کے عادی نہیں ہیں۔ وہ صاف گوئی سے اپنی بات کہتے ہیں۔ ان کی یہی ادبی دیانتداری انہیں افراط وتفریط سے گریز کا حوصلہ دیتی ہے۔ شاہ نواز قریشی بھلے ہی ان مضامین کو تنقیدی نہ مانیں مگر مضامین کے مطالعہ کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ ان کا تجزیاتی انداز تنقید کی سرحد کو چھوتا نظر آتا ہے یعنی ان میں تنقیدی جراثیم موجود ہیں۔ نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش ہیں:

فراق، مولانا آزاد یا مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی کی طرح خطیب یا مقرر نہیں تھے۔ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے لیکن اپنے طنزیہ اور مزاحیہ جملوں سے ایک لطف پیدا کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم اردو مصنفین کی کانفرنس میں ان کی ایک گھنٹے کی تقریر نے سامعین کو باندھ لیا تھا، جو ان کے ہر جملے پر داد دے رہے تھے۔ (ص ۱۹)

'کھلی کتاب' کے بقیہ تمام خاکوں میں معروضیت، جذباتیت پر حاوی نظر آتی ہے لیکن جن خاکوں میں جذباتیت در آئی ہے یا جذباتیت حاوی ہے وہ ان خاکوں کا عیب نہیں، حسن بن گئی ہے۔ ان خاکوں کے سلسلہ میں بغیر کسی پس و پیش کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عابد سہیل نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کی ایک ایسی بھرپور متحرک تصویر پیش کر دی ہے کہ خاکے اسٹل فوٹوگرافی کے بجائے ویڈیو گرافی میں ڈھل گئے ہیں۔

مندرجہ بالا مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ نواز قریشی معروضوں پر قلعے تعمیر کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ ہر طور پر معروضی دلائل اور استدلال سے برآمد نتائج کو ہی بنیاد بنا کر ادبی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور یہ بات ان کے سلجھے ادبی مذاق کی غماز ہے۔

امید ہے کہ باذوق اور سنجیدہ قارئین اسے اپنے مطالعہ کا حصہ بنائیں گے اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

❑❑❑

دنیا کی کسی بھی زبان وادب کی تعمیر وتشکیل میں اس کے سماجیات کا اہم رول ہوتا ہے، انسان کی سماجی، تہذیبی و ثقافتی تمدن کے آپسی اختلاط سے زبان کی نہ صرف نشوونما ہوتی ہے بلکہ اس کے ارتقا میں سماج کے بدلاؤ کا بھی ایک کردار ہوتا ہے۔ دنیا کے بیشتر ادب میں بچوں کا بھی ایک ادب ہوتا ہے جسے ادب اطفال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اطفال ادب ایک ایسا ادب ہے جس کے ذریعہ ایک مضبوط ادب کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس کا اصل مقصد نہایت ہی منصوبہ بند طریقے سے بچوں کی ذہنی پرورش اور ان کے اندر ادب پیدا کرنے کی رجحان سازی کے عمل کی تدوین ہے۔

ہمارے اردو ادب میں بہت سے ایسا ادبا اور شعرا گزرے ہیں جنھوں نے اطفال ادب پر بڑی دلجمعی کے ساتھ کام کیا ہے۔ چونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ادب کے مستقبل کو تابناک بنانا ہو تو بچوں کے اندر ادب کی تحریک پیدا کی جائے، اس لئے کہ ادب کا مستقبل انھوں بچوں کے اوپر ہی انحصار کرتا ہے۔

شبیر حمد کی کتاب ''بچوں کے رابندر ناتھ'' اس بات کی طرف کھلا ہوا اشاریہ ہے کہ بچوں کی ادبی کفالت ایک تحریک کی صورت میں کی جانی چاہئے۔ غالباً اسی نکتہ کے تحت انھوں نے بنگالی ادب کے مشہور شاعر اور ادیب رابند ناتھ ٹیگور کی ان کہانیوں اور نظموں کا اردو ترجمہ کیا ہے جو بچوں کے ادب سے متعلق ہیں۔

رابند ناتھ ٹیگور بنگالی ادب کے ایک ایسے شاعر اور دانشور گزرے ہیں جنھوں نے بنگالی ادب میں ایک بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ آج ان کی بہت سی کتابیں موجود ہیں، جو تخلیقی ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ان کا مشہور ناول ''چوکھیر بالی''، ''گھرے بائرے''، ''نوکا ڈوبی''، ''چہار ادھیارے''، ''گورا جو گا جاگ''، وغیرہ لیکن ان کی سب سے مشہور کتاب ''گیتا نجلی'' ہے۔ جس کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمے کئے گئے ہیں اور ان کی یہی وہ کتاب ہے جس پر انھیں ۱۹۱۳ میں انھیں نوبل انعام سے بھی نوازا گیا۔ انہیں بنگالی ادب میں افسانہ نگاری کا موجد کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۶/سال کی عمر یعنی ۱۸۷۷ء میں ایک افسانہ ''بھیکارنی'' کے نام سے لکھا جو کافی مقبول ہوا۔

ایسا ذہین اور دانشور شخص بھلا کس طرح بچوں کے ادب سے صرف نظر کرتا، اس لئے انھوں نے بچوں کے لئے بہت سی کہانیاں اور نظمیں لکھیں جن کے تراجم ہندی انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی ہوئے۔

اسی سلسلے کی ایک کتاب ''بچوں کے رابندر ناتھ'' کے نام سے شبیر احمد نے ترجمہ کی اور اس کی تدوین کا بھی کام انجام دیا۔ اور اس کی اشاعت ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'' کے مالی تعاون سے ہوئی۔ شبیر احمد نے اس کی فہرست سازی تین حصوں میں کی ہے پہلے حصہ میں ''کہانیاں'' کے ذیلی عنوان ''گپ شپ'' (گپلو شپلو) کو رکھا ہے جس میں ساری کہانیاں بچوں سے متعلق ہیں، جو انتہائی سبق آموز اور بچوں میں تہذیب و تمدن کے ساتھ ادبی ماحول کی تحریک دینے کے لئے لکھی گیں ہیں۔ اس کے چند عناوین اس طرح ہیں،

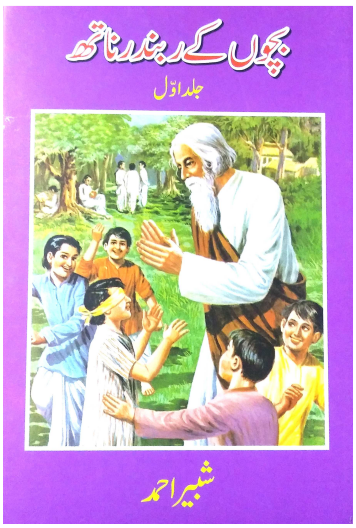

مبصر : شاہد کمال

قیمت : 550 روپئے

ناشر : گلستان پبلیکیشنز، کلکتہ

ملنے کا پتہ

گلستان پبلیکیشنز 67، مولانا شوکت علی اسٹریٹ، کلکتہ

''سائنسداں''، راجا کا محل''، جادوگر''، پری''، اور بھی سچ''، زمیندار صاحب''، پنّا لال''، چوہوں کی دعوت''، وغیرہ شامل ہیں۔

اس کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ''ہنسی تماشے'' ہیں جو ڈرامے سے متعلق ہیں۔ ان کے تمام ڈرامے اپنے سماج کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ جس میں بڑی فنی مہارتوں کے ساتھ ان نکات کو واشگاف کیا گیا ہے، جو ہمارے سماج کا ایک حصہ ہے۔ ہمارے سماج میں رہ رہے ان کمزور طبقوں کی آواز بلند کی گئی ہے جو صاحبان ثروت کے جبر کی شکار ہیں۔ اس کو پڑھنے کے بعد بچے بھی بغیر کسی جزوی استعانت کے ان ڈرامے کے اصل مفہوم کو درک کر سکتے ہیں۔

اس کتاب کا سب سے اہم عنوان 'نظمیں' کے نام سے ہے۔ جس میں مختلف موضوعات سے متعلق رابندر ناتھ ٹیگور کی بچوں کے حوالوں سے کہی جانے والی نظموں کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ ''ٹپ ٹپ پانی برسے''، کشتی کا سفر''، دیش دنیا''، الٹا پلٹا''، دعا''، بخیل''، بہادر آدمی''، راجکمار راجکماری'' اور قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ان نظموں کے ترجمہ میں زبان بہت ہی سادہ اور شستہ ہے۔ خاص کر شبیر احمد نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ یہ نظمیں بچوں سے متعلق ہیں لہذا زیادہ ثقیل بوجھل لفظوں کے استعمال سے پرہیز کیا جائے۔ تاکہ بچے اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔ مثال کے لئے شبیر احمد کی ترجمہ کی ہوئی نظم ''الٹا پلٹا'' کو اپنے قارئین کے لئے پیش کرتا ہوں۔

کانتی بڑھیا کی دودھیا ساس
رہتی ہے کالنا میں
ساریاں پسارتی ہے چولہے پر
ہانڈیا رکھتی ہے آلنا میں
بدمعاش لوگوں سے تنگ آکر
صندوق میں چھپ جاتی ہے
روپیوں کو ہوا دکھانے کو
کھلی کھڑکی کے پاس رکھ جاتی ہے
نمک وہ ڈالتی ہے پان میں
چونا لگاتی ہے پکوان میں

شبیر احمد نے رابند ناتھ ٹیگور کی نظموں کا ترجمہ بڑے سلیس انداز میں کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اردو سے زیادہ ہندی کے الفاظ استعمال کئے ہیں، یہی ایک بات اس نظم میں کھٹکتی ہے، چونکہ اسے اردو ترجمہ کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن زیادہ تر اس کے ترجمہ میں ہندی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، یہ بات محل نظر ضرور ہے۔ ویسے مجموعی طور پر شبیر احمد کا یہ کام لائق تحسین ہے مجھے امید ہے کہ ان کے قارئین ان کے اس کام کو فراموش نہیں کریں گے۔

❑❑❑

या क्लब